www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10₹

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2019

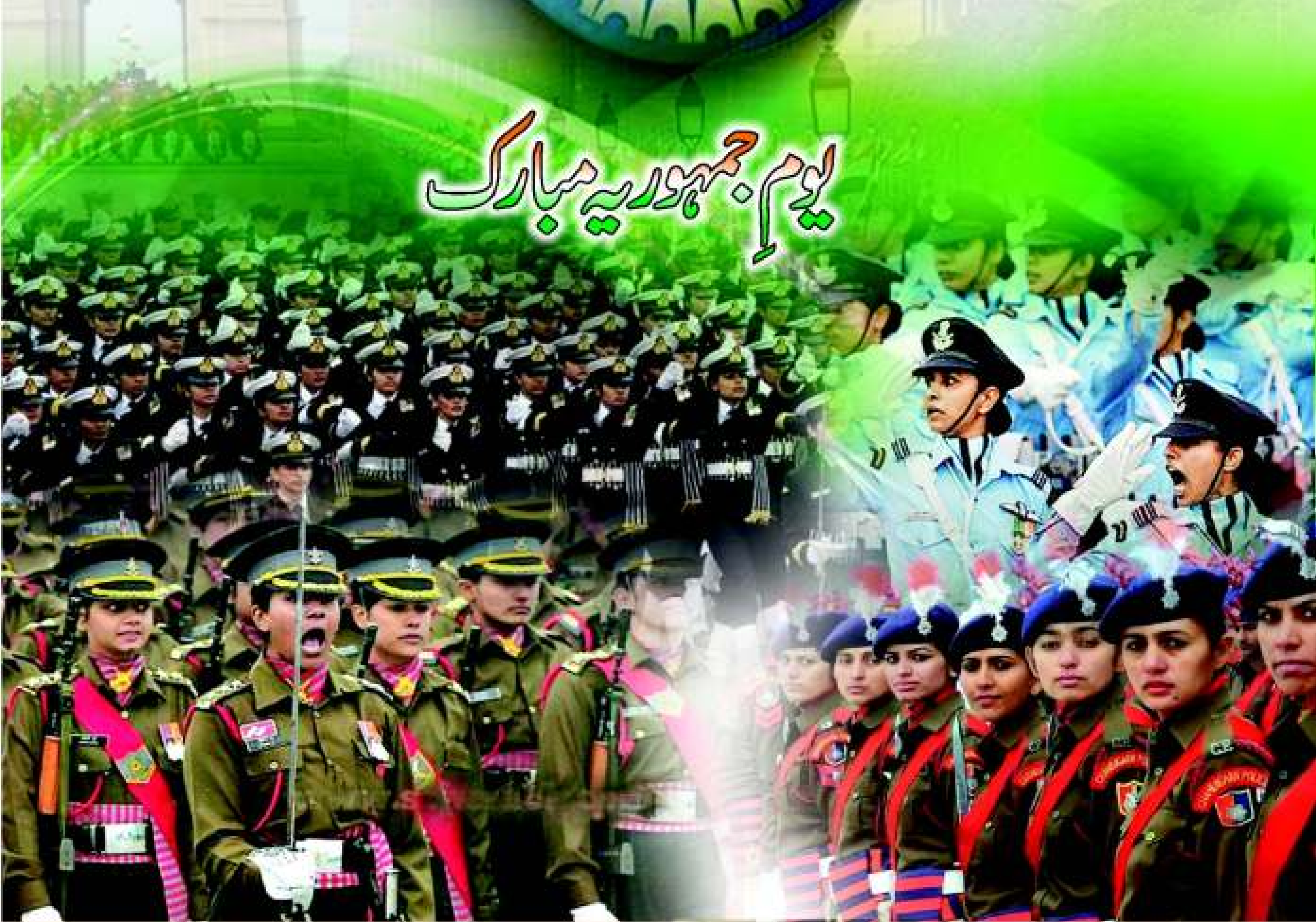

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

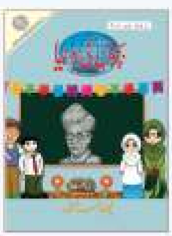

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

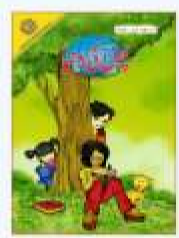

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

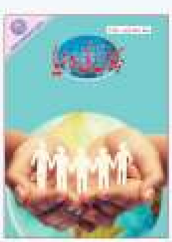

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	بھارت کی پہلی معلمہ: ساوتری بائی پھلے	سمیع الدین (اطہر)	5
	1857 کی پہلی خاتون مجاہدہ : عزیزن بائی	ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان	6
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہان نسواں	نسائی ادب کا خوبصورت استعارہ: فہمیدہ ریاض	صابر علی سیوانی	9
	جان بارتھ وِک گل کرسٹ	ڈاکٹر ناہید فاطمہ	14
	تانیثیت، خواتین فکشن نگار اور عورتیں......	شاہین بیگ	18
	عبدالحلیم شرر تعلیم نسواں کی ایک منفرد آواز	رقیہ نبی	22
	عہد ماضی میں خواتین کے کارنامے	کلثوم فاطمہ نصیر	28
	کشمیر کی خواتین فکشن نگاروں کے فکشن میں......	عشرت رسول	31
کہانیاں	اے جذبۂ دل گر میں چاہوں۔۔۔!	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	37
	آدھے ادھورے	نصرت شمسی	41
	نیکی کا صلہ	سعدیہ راشد	44
	راضی	زبیدہ معین الدین	47
حسن سخن	صفیہ شمیم، زاہدہ زیدی، ثمینہ راجہ، نوید اختر پروانہ برہانپوری		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	خون کا دباؤ (بلڈ پریشر)	حسین فاروقی	55
آرائش وزیبائش	جلد کی دیکھ بھال	حمیرا خاتون	58
تاثرات	نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 1 جنوری 2019

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

قارئین خواتین دنیا کو قومی کونسل فروغ اردو زبان کی جانب سے نئے سال اور یومِ جمہوریہ کی مبارک باد۔ یومِ جمہوریہ اور نئے سال کی آمد کے ساتھ خواتین دنیا کا تازہ شمارہ قارئین کے لیے پیش ہے۔ خواتین دنیا میں نئی خواتین قلمکاروں کو خصوصیت سے شائع کیا جاتا ہے۔ ہماری نئی خواتین قلمکار اردو ادب کے فروغ کی حتی الامکان کوشش کر رہی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ خواتین دنیا کو مزید بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں ہمارا رسالہ خواتین دنیا نئی نسل کے لیے مشعل راہ بنے اور حوصلہ کا ضامن بھی ہوتا کہ اس رسالے کے اجرا کا مقصد پورا ہو اور وہ خواب جو رسالہ خواتین دنیا کے حوالے سے ہم نے دیکھا ہے وہ شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک خواتین نے مختلف میدانوں میں مختلف خدمات انجام دی ہیں۔ کھیل، موسیقی، جنگ آزادی نیز تعلیم غرض کسی بھی شعبے میں خواتین پیچھے نہیں رہی ہیں۔ ان کی شناخت معاشرے میں آہستہ آہستہ وجود پذیر ہوئی۔ آج خواتین ترقی کے زینے پر ایک ایک کر کے قدم بڑھا رہی ہیں اور اپنے مقصد کی حصولیابی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

عہد ماضی میں اگر خواتین کے کارناموں کی بات کی جائے تو ہمارے لیے یہ بھی فخر کی بات ہوگی کہ ہر شعبہ حیات میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چاند بی بی، زینت محل، رضیہ سلطانہ، بیگم حضرت محل، بی اماں، لکشمی بائی یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے ملک کی خدمت میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ انھوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمنوں سے جنگیں لڑیں اور انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔

1857 کی جنگ آزادی کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ 1857 سے لے کر 1947 تک ہندوستان نے بہت کچھ کھویا۔ اپنی آزادی گنوائی، دوسروں کے زیر اقتدار رہا۔ غلامی کے اس طوق کو اتارنے کے لیے ہندوستانیوں نے بہت جدوجہد کی۔ اس لڑائی میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ خواتین نے بھی آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک آزادی کی بات کی جاتی ہے تو ہمارے ذہن میں خواتین کے تعلق سے کچھ نام ابھرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک نام جو ہمارے حافظے میں نہیں آتا وہ عزیزن بائی کا ہے۔ عزیزن بائی نے 1857 کی جنگ لڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ وطن ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ کہنے کو تو وہ ایک رقاصہ تھیں لیکن ان کے دل میں اپنے وطن کے تئیں ہمدردی اور محبت تھی۔ اس بات کا اندازہ 1857 کی جنگ آزادی میں ان کی شہادت سے لگایا جا سکتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں اگر لڑکیوں کی تعلیم کی بات کی جائے تو اس وقت لڑکیوں کا تعلیمی شعور اتنا پختہ اور بلند نہیں تھا جتنا کہ آج نظر آتا ہے۔ اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔ ساوتری بائی پھلے نے لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول قائم کیا۔ ان کے اس قدم کی مخالفت بھی ہوئی باوجود اس کے وہ ہمیشہ اپنے مقصد کے تئیں بیدار رہیں۔ ساوتری بائی پھلے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی پہلی معلمہ تھیں۔ انھوں نے مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے اپنی ہمت کو پست نہیں ہونے دیا اور پوری دیدہ دلیری کے ساتھ ظلم و زیادتی کا مقابلہ کیا۔ ساوتری بائی پھلے نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول کی بنیاد ڈال کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر خواتین پڑھ لکھ جائیں تو ایک مکمل اور بہتر معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

آج بھی ہندوستان میں بہت سے علاقوں میں خواتین کی زندگی فرسودہ روایات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان زنجیروں کو توڑتے اور اپنے لیے ایک نئے سماج کی تشکیل کرنے کا فریضہ خواتین کو ہی انجام دینا ہوگا۔ جس کے لیے ہماری خواتین کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس شمارے میں خواتین کی تخلیقی حسیت اور تنقیدی بصیرت کے حوالے سے بہت سی تحریریں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنے قارئین کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے معیاری افسانے اور دیگر موضوعات پر مبنی بیش قیمت مضامین رسالے میں شامل کیے ہیں۔ آپ کے تاثرات ہمیں حوصلہ بخشتے ہیں۔ اپنی قیمتی آرا ہمیں ضرور بھیجیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

سمیع الدین (اطہر)

بھارت کی پہلی معلمہ

ساوتری بائی پُھلے

(پ: 3 جنوری 1837ء، و: 10 مارچ 1897)

آج تعلیمی میدان میں لڑکیاں ترقی کر رہی ہیں، لیکن ڈیڑھ سو سال قبل اس طرح حالت نہ تھی، لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنا ہمت کی بات تھی۔ اس طرح کا خیال کرنا یا لڑکیوں کو تعلیم کے لیے بھیجنا سماج کی مخالفت کرنے جیسا تھا، لیکن لڑکیوں کی تعلیم ہونا ضروری ہے۔ سماج سدھارک، مہاتما پھلے ساوتری بائی پھلے نے ہمت کر کے 1848 میں پونہ شہر میں لڑکیوں کی تعلیم کا پہلا اسکول قائم کیا، لیکن ان لڑکیوں کو پڑھائے گا کون؟ یہ بڑا سوال تھا۔ پھر جیوتی بائی پھلے نے اپنی ان پڑھ بیوی کو لکھنا پڑھنا سکھایا اور اسکول کی پہلی معلمہ کے عہدے پر تقرر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک انقلابی کام تھا جس کی وجہ سے سماج میں مخالفت شروع ہوگئی، ان کے والد نے بھی معلمہ کے پیشے اور لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کی لیکن جیوتی با پھلے اور ان کی بیوی ساوتری بائی پھلے نے ہمت نہیں ہاری، آہستہ آہستہ لڑکیوں کی تعداد اسکول میں بڑھنے لگی، اعلیٰ طبقے کو چھوڑ کر انھوں نے پست طبقے کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول شروع کیا، تعلیمی پیشے میں انھیں کافی جسمانی و ذہنی اذیت اٹھانی پڑی، ساوتری پر کیچڑ کے گولے پھینکے گئے لیکن ساوتری بائی نے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے لڑکیوں کو تعلیم دی اور کبھی پیچھے نہیں ہٹیں۔ گھر سنسار کا خرچ کم کر کے اسکول کے کام میں پیسہ خرچ کرتیں۔

ساوتری بائی نے 1850 تا 1890 میں نظمیں لکھنا شروع کیں اور ان کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ 1893 میں ''ساسرواڑ'' مقام پر ستیہ شودھک سماج کا ایک بڑا سیمینار منعقد ہوا اس سیمینار کی صدارت ساوتری بائی پھلے نے انجام دی تھی، ساوتری بائی اور جیوتی با پھلے کی کوئی اولاد نہیں تھی، یتیم بچوں کی ماں اور باپ کا حق ادا کرتے رہے، ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا وقت دیا کرتے تھے۔ 10 مارچ 1897 میں پونہ شہر میں طاعون کی بیماری پھیلی اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا۔

3 جنوری 1837ء کو ساوتری بائی پھلے کا جنم ہوا۔ یہ پہلی تعلیم یافتہ لڑکی اور پہلی معلمہ تھیں۔ اس زمانے میں، جس نے ہمت نہ ہار کر اپنی تعلیم جاری رکھی اور ''پہلی معلمہ'' بن کر لڑکیوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ ساوتری بائی پھلے اور جیوتی با پھلے کا ایک اور کام یادگار رہے گا کہ انھوں نے بچپن کی شادی اور بچپن میں بیوہ ہونے والی لڑکی کے بال تراشنے کی رسم کی مخالفت کی۔ انھوں نے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہڑتال کی تھی جو کامیاب رہی۔ لڑکی کے بیوہ ہونے پر سفید ساڑھی پہننے کی بھی مخالفت کی تھی۔ ساوتری بائی نے مردوں جیسا کام کیا ہے آیئے ہم انھیں خراج عقیدت پیش کریں۔ (بشکریہ روزنامہ رہبر اورنگ آباد)

□□□

Samiuddin (Athar)
Raheem Plaza, Flat No.4
VIP Road, Near Town Hall
Aurangabad-431001 (MS)

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

1857 کی پہلی خاتون مجاہدہ

عزیزن بائی

ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔اس میں ہندوستانی خواتین نے راست یا بالواسطہ طور پر ملک کے لیے قربانیاں دیں۔انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ملک عزیز سے محبت رکھتی ہیں۔ان میں سرفہرست عزیزن بائی کا شمار ہوتا ہے۔جو 1857 کی پہلی خاتون مجاہدہ ہے۔اس جانباز اور دلیر خاتون نے جنگ آزادی میں شامل ہوکر اہم کارنامے انجام دیے اور ملک عزیز پر اپنی جان نچھاور کردی۔

عزیزن بائی کان پور کے قریب بٹھور کی رہنے والی تھی۔والد کا نام حسین خان اور والدہ کا نام حمیدہ بیگم تھا۔والدین کی موت پر حالات نے اسے رقاصہ بنا دیا تھا۔مشہور رقاصہ امراؤ جان ادا کے سارنگی محل میں بھی عزیزن باشعور اور دانشمند خاتون تھی۔وہ قوم و ملک سے محبت رکھتی تھی اور اسی محبت نے اسے ایک مجاہدہ اور محب وطن بنا دیا۔

ایک روایت کے مطابق تری بھون سنگھ کی وجہ سے متاثر ہوکر جنگ آزادی میں شامل ہوگئی تھیں۔ایک مرتبہ انگریز سپاہی تری بھون سنگھ کا پیچھا کر رہے تھے۔بھون سنگھ نے عزیزن کے گھر میں پناہ لی۔عزیزن نے انگریزی فوج سے چھٹکارہ دلایا اور پیچھا کرنے کا سبب پوچھا۔تری بھون سنگھ نے کہا کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ''انگریزوں کا خاتمہ ہو اور ہمارا ملک آزاد ہو۔اس شخص نے بائی کو جنگ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور تاتیا ٹوپے کے پاس بھیجا۔عزیزن بائی نے تاتیا ٹوپے سے ملاقات کی۔وہ عزیزن بائی کے جذبہ حب الوطنی سے بے حد خوش ہوئے۔انھوں نے بائی سے کہا لڑائیاں صرف تلواروں سے ہی نہیں بلکہ حکمت سے بھی لڑی جاتی ہیں۔تم ایک رقاصہ کی حیثیت سے کانپور چھاؤنی کے افرانی سے میل جول بڑھاؤ۔جب وہ تم پر اعتماد کرنے لگیں تو ان کے راز حاصل کرکے ہمیں پہنچاؤ۔عزیزن نے تاتیا ٹوپے کے کہنے کے مطابق اپنی بقیہ زندگی مکمل آزادی کے لیے وقف کردی۔

حسن مثنیٰ اپنی تصنیف ''1857 'نکات اور جہات میں لکھتے ہیں۔عزیزن کا عاشق شمس الدین کانپور کے باغی سپاہیوں کا رہنما تھا۔اسے عزیزن کی راگ بھیروی سے عشق تھا۔وہ عزیزن کی محفل میں اکثر انقلابی مقصد بناتا۔وہ جب فرنگیوں کے مظالم اور بے رحمانہ قتل کے مناظر کھینچتا تو عزیزن کی آنکھوں میں آنسو آتے۔انھیں دنوں 10رمئی 1857 کو میرٹھ میں انقلاب کا بگل بجایا تو انھیں اٹاوہ کے انقلابی سرگرمیوں میں عزیزن کے بھائی اور دیگر افراد خانہ کو انگریزوں نے تہہ تیغ کردیا۔عزیزن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔شمس الدین نے'' رونے کی وجہ پوچھی عزیزن نے استفسار سے جواب دیا۔لیکن تم لوگ ابھی تک خاموش بیٹھے ہو؟

7رجون 1857 کو ناناصاحب پیشوا کی جانب سے ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی کہ وہ اپنے ملک و مذہب کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لیے متحد ہوجائیں اور فوج میں بھرتی ہوں۔یہ اعلان سنتے ہی یہ مجاہدہ گھربار چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت میدان جنگ میں کود پڑی۔شمس الدین کے تعاون سے اس نے خواتین کی ایک چھوٹی سی فوج منتظم کی۔کہا جاتا ہے کہ وہ گھر گھر جاتی تھیں۔عورتوں کو گھوڑ سواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی تھیں۔وہ خود اپنے فوجی دستے کی مخصوص وردی میں ملبوس بے خوف و خطر تلوار لیے گھومتی تھی۔

حکومت اتر پردیش کی طرف سے شائع کی گئی کرنند سروپ مصرا کی مرتبہ کتاب ''ناناصاحب پیشوا'' جنگ آزادی میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ خواتین کے فوجی دستہ کا قیام اس عظیم مجاہدہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

خواتین کا یہ دستہ زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتا۔ سپاہیوں کے لیے گولی بارود فراہم کرتی، ان کے لیے کھانے اور کپڑے فراہم کرتی اور فوجیوں کے لیے گھر گھر سے تازہ پھل، مٹھائی اور میوے بھی اکٹھا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس کے اہم فرائض میں جاسوسی کرنا، جنگی اطلاع حاصل کرنا اور ان کو مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچانا اور ان بزدلوں کو شرم بھی دلاتا تھا جو خوف کے سبب اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ عزیزن ایسے مردوں کو خود چوڑیاں پہناتی' اس شرمندگی سے بچنے کے لیے عوام نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا تھا۔ خواتین کا یہ فوجی دستہ مخصوص وردی میں ملبوس گھوڑوں پر سوار ہاتھ میں تلواریں لیے گزرتا تھا۔''

انگریزوں کا ایک خبری نانک چند عزیزن کی مقبولیت کے بارے میں لکھتا ہے ''وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے جب سڑکوں پر نکلتیں تو قصبہ کی پوری فضا ''عزیزن کی جے'' کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ ہتھیاروں سے لیس عزیزن لگاتار ادھر ادھر بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔ اکثر وہ سڑکوں پر بے حال اور زخمی باغی فوجیوں کو پھل، دودھ اور مٹھائی تقسیم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''

عزیزن کے متعلق اس دور کا ایک معروف قلم کار لکھتا ہے:

''عزیزن آزادئی وطن کے جذبے سے اس قدر سرشار تھیں کہ ہروقت فوجی وردی پہنے رہتی تھیں۔ انھیں اپنے فوجی ساتھیوں سے برابر رابطہ قائم رکھتی تھیں۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ ملک کی آزادی' مادر وطن کا انگریزی سامراج کے مظالم سے چھٹکارہ۔''

25/جون 1857 کو کانپور کے انقلابیوں کی فتح ہوئی۔ انگریز سپہ سالار وہیلر نے ہتھیار ڈال دیے۔ پناہ گزیں انگریزوں کو نانا صاحب نے الہ آباد روانہ کرنے کے لیے ستی چورا گھاٹ پر بھیجا جہاں عوام نے قتل عام برپا کر دیا۔ انگریزوں کی تقریباً 150 عورتیں اور بچے جو باقی بچے تھے۔ بی بی گھر کی عمارت میں بحفاظت پہنچا کر عزیزن کو جیلر کی حیثیت سے متعین کر دیا۔ عزیزن انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ 25 جون میں اس کا بھائی اور افراد خاندان کا قتل ہوا تھا اور 12 جولائی 1857 کو اس کا عاشق شمس الدین بھی فتح پور کے انقلاب میں شہید ہو گیا تھا۔

عزیزن نے نانا کے سپہ سالار تاتیا توپے سے کہا کہ جنگ میں جب بدلا لینے کا موقع ملے تو رحم دلی نہیں دکھانی چاہیے۔ ان ہی عورتوں نے جاسوسی کی اور اپنے شوہروں کو بندوقیں بھر بھر کر دیں۔ تاتیا نے جواب

''انگریزوں کا ایک خبری نانک چند عزیزن کی مقبولیت کے بارے میں لکھتا ہے'' وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے جب سڑکوں پر نکلتیں تو قصبہ کی پوری فضا'' عزیزن کی جے'' کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ ہتھیاروں سے لیس عزیزن لگاتار ادھر ادھر بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔ اکثر وہ سڑکوں پر بے حال اور زخمی باغی فوجیوں کو پھل، دودھ اور میٹھائی تقسیم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے''

دیا عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔ عزیزن نے کہا۔ انگریزوں نے ہماری جیسی بے گناہ عورتوں کا قتل کیا ہے تو ہم کیوں رحم دلی سے کام لیں۔ عزیزن بی بی گھر گئیں اور وہاں پر سپاہیوں کو تیغ کرنے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے بھی انکار کیا تو عزیزن نے قتل کرا دیا۔

بعد ازاں ہیولاک کی فوج نے حملہ بول دیا۔ عزیزن نے انقلابیوں کی ہر طرح سے مدد کی لیکن دھوکہ سے ایک تاجر نے گرفتار کروا دیا۔ ہیولاک نے عزیزن کے حسن پر فریفتہ ہو کر اس سے معافی مانگنے کے لیے کہا لیکن عزیزن نے انکار کر دیا۔ ہیولاک نے کہا تم کیا چاہتی ہو؟ عزیزن نے کہا ''برٹش حکومت کا خاتمہ''۔

ہیولاک نے غصہ ہو کر فائر کرنے کا حکم دیا۔ ''اسے گولیوں سے اڑا دو۔'' عزیزن کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ کلمہ پڑھتے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ اس طرح عزیزن آزادی وطن کے لیے شہید ہو گئی۔

استفادہ کردہ کتب:

☆ 1857 نکات اور جہات۔ حسن مثنیٰ

☆ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع

☆ انڈیا کی مشہور خواتین۔ عبدالعزیز عرفان

☆ روزنامہ راشٹریہ سہارا ممبئی۔ 16/اگست 2015

☆ تاریخ کے جھروکے سے۔ ڈاکٹر محمد خضر بیگ اورنگ آباد

□□□

Dr. Abdul Aziz Irfan

Opp. Maulana Azad College

Dr. Zakariya Road, National Colony

Plot No. 34, Aurangabad-431001 (MS)

شاعرات کے منتخب اشعار

یہ حوصلہ بھی کسی روز کر کے دیکھوں گی
اگر میں زخم ہوں اس کا تو بھر کے دیکھوں گی

میں روشنی ہوں تو میری پہنچ کہاں تک ہے
کبھی چراغ کے نیچے بکھر کے دیکھوں گی

عزیز بانو داراب وفا

معتبر سے رشتوں کا سائبان رہنے دو
مہرباں دعاؤں میں خاندان رہنے دو

مضمحل سے بام و در خستہ حال دیواریں
باپ کی نشانی ہے وہ مکان رہنے دو

عذرا نقوی

نمائشوں میں رکھی آنکھ ڈھونڈتی ہے انہیں
جو لوگ اپنے لہو کے نشاں پہ زندہ ہیں

معنی کے سارے رنگ ہیں تیغ برہنہ سر
لفظوں کی کیفیت مگر کمخواب کی سی ہے

کشور ناہید

اک سفر سے لوٹ کر آئی تو بے مہلت مجھے
زندگی نے اک سفر پر پھر روانہ کر دیا

جاتے جاتے میں نے تجھ تک کاٹ دی اک زندگی
آتے آتے تو نے مجھ تک اک زمانہ کر دیا

شاہدہ حسن

تمام فکر زمانے کی ٹال دیتا ہے
یہ کیسا کیف تمہارا خیال دیتا ہے

اداس آنکھوں سے دریا کا تذکرہ کر کے
زمانہ ہم کو ہماری مثال دیتا ہے

اندرا ورما

ورق ورق میں سمو دے مجھے کتاب میں رکھ
میں زندگی ہوں مجھے وقت کے نصاب میں رکھ

مہک مہک کے بکھرتی میں اس کے آنگن میں
وہ اپنے گھر کا دریچہ اگر کھلا رکھتا

عفت زریں

جو مٹتا جا رہا ہے پھر وہی منظر بنانا ہے
مجھے احساس کی دیوار میں ایک در بنانا ہے

کنارِ دشت اک کشتی ہے اور پتوار ہاتھوں میں
سو اب دریا مجھے اس دشت کے اندر بنانا ہے

یاسمین حمید

میں آبِ عشق میں حل ہو گئی ہوں
ادھوری تھی مکمل ہو گئی ہوں

بہت تاخیر سے پایا ہے خود کو
میں اپنے صبر کا پھل ہو گئی ہوں

حمیرا راحت

فہمیدہ ریاض

نسائی ادب کا خوبصورت استعارہ

صابر علی سیوانی

ترقی پسند تخلیق کار فہمیدہ ریاض جن کی پیدائش ہندوستان کے شہر میرٹھ (یوپی) میں 28 جولائی 1946 کو ہوئی تھی، انھوں نے 22 نومبر 2018 کو کراچی پاکستان میں آخری سانس لی۔ فہمیدہ نے نسوانی حسیت اور نسائی جذباتیت کی ترجمانی کو ہی اپنی تخلیقات کا بنیادی اثاثہ قرار دیا۔ وہ مرد اساس معاشرے پر آخر تک نالاں رہیں اور خواتین کے ساتھ روا ناانصافی کو ہدف تنقید بناتی رہیں۔ ان کی شاعری میں جنس زدگی کے عناصر ابھرتے ہوئے نقوش کی طرح نمایاں ہوتے رہے۔ حکومت وقت کی گریباں گیری کو انھوں نے اپنی شاعری کا وسیلہ بنایا تھا اور ایک نظم 'چادر اور چار دیواری' لکھنے کی پاداش میں انھیں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور آمریت میں فہمیدہ ریاض پر دس سے زائد مقدمات دائر کیے گئے۔ بالآخر انھیں ایک مشاعرے میں شرکت کے بہانے ہندوستان آنے کا موقع ملا۔ یہاں ان کی دوست امریتا پریتم کی سفارش پر انھیں ہندوستان میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے لیے پوئیٹ اِن ریسڈنس کے طور پر کام کیا۔ دہلی میں ہی انھوں نے جلاوطنی کی مدت میں ہندی سیکھی۔ جب وہ جلاوطنی کی زندگی گزار کر پاکستان لوٹیں تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

فہمیدہ ریاض فارسی زبان وادب سے بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ انھوں نے فارسی زبان کی باغی شاعرہ فروغ فرخزاد کی شاعری سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ فروغ فرخزاد کی ہی طرح اردو میں فہمیدہ نسائی جذبات کی صحیح عکاسی کرنے والی شاعرہ تھیں۔ فروغ فرخزاد جس کی شاعری نے ایران کے روایت پسند معاشرے میں کھلبلی مچادی تھی۔ اس نے کھل کر شہوانی جذبات اور نسائی احساسات کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور جنسی ناآسودگی کے احساس کی ترجمانی کی، اسی طرح فہمیدہ نے بھی اپنی شاعری خصوصاً نظموں کے ذریعے عورت کے دل میں چھپے احساسات کو برملا طور پر بیان کرکے یہ پیغام دیا کہ اس مرد اساس معاشرے میں عورت بھی اپنے پوشیدہ جذبات کا اظہار اپنی تخلیقات کے ذریعے کرسکتی ہے۔

فہمیدہ ریاض نے فروغ کی نظموں کا منظوم ترجمہ 90 کی دہائی میں کیا تھا جو 'کھلے دریچے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروغ کی یہ نظمیں فہمیدہ ریاض کے خیالات وافکار سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ فروغ فرخزاد کو جو رتبہ جدید فارسی شاعری میں حاصل ہے، وہی مقام فہمیدہ کا جدید اردو شاعری میں ہے۔ حالانکہ انھوں نے مثنوی مولانا روم کا بھی منظوم ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن ان مثنویوں کے اثرات ان کی شخصیت اور شاعری پر نہیں دیکھے جاتے ہیں۔ گوداوری، خطِ مرموز اور دیگر کئی شاہکار نظموں کی تخلیق کار فہمیدہ ریاض کے متعلق علی ارقم نے اپنے ایک مضمون 'فہمیدہ ریاض: فرخزاد سے شہرزاد تک' میں ان کی توانا آواز کے حوالے سے لکھا ہے:

> '60 کی دہائی میں اپنی اثر انگیز تانیثی شاعری کے لیے معروف ایرانی خاتون شاعر فروغ فرخزاد کی زندگی کا چراغ گل ہوا، جب وہ 33 برس کی عمر میں ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کرگئیں، لیکن اپنی مختصر عمر میں انھوں نے شعروادب کی تانیثی روایت پر جو اثرات چھوڑے، وہ آج بھی قائم ہیں اور یہ محض اتفاق نہیں کہ ان ہی زمانے میں اردو مجلے 'فنون' کے صفحات پر اردو ادب میں ایک ایسی توانا نسائی آواز ابھر

رہی تھی جسے اگلے پچاس برسوں میں اپنے طرز اظہار سے نئی روایات قائم کرنی تھیں اور سماجی و سیاسی سطح پر نسائی اظہار کے طے شدہ سانچوں کو توڑتے چلے جانا تھا۔ یہ آواز فہمیدہ ریاض کی تھی، جن کے شعری مجموعے 'پتھر کی زبان' نے ویسا ہی تلاطم پیدا کیا جیسا عصمت چغتائی نے فکشن کے میدان میں پیدا کیا اور جیسا ان کی پسندیدہ خاتون شاعر فروغ فرخزاد نے فارسی شاعری میں پیدا کیا تھا۔'

(روزنامہ انقلاب، ممبئی مورخہ 25 نومبر 2018)

فہمیدہ فارسی کی توانا آواز کی حامل شاعرہ فروغ فرخزاد سے بہت متاثر تھیں، لیکن ان کی شاعری پر ہندی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی جلا وطنی کے زمانے میں ہندی زبان و ادب سے بہت قریب ہوئیں۔ ہندی کے لوگوں نے بھی ان کی پذیرائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد جو مضامین اخبارات میں ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شائع ہوئے، ان میں ہندی کے اخبارات بھی پیش پیش رہے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی داں طبقے میں بھی ان کی مقبولیت کم نہیں رہی ہے۔ ان کی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے اور اس سے خاطر خواہ استفادے کے لیے ہندی زبان کا علم ہونا ضروری ہے۔ ان کی کوئی بھی نظم پڑھ جائیے، اس میں ہندی کے متعدد الفاظ مل جائیں گے۔ اپنی ایک نظم 'انقلابی عورت' میں انھوں نے عورت کی نفسیات کو، اس کی فکر کو، اس کے احساس کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس نظم کے آغاز میں لکھتی ہیں:

رَن بھومی میں لڑتے لڑتے میں نے کتنے سال
اک دن جل میں چھایا دیکھی چٹے ہوگئے بال
پاپڑ جیسی ہوئیں ہڈیاں، جلنے لگے ہیں دانت
جگہ جگہ جھریوں سے بھرگئی سارے تن کی کھال

نظم کے ان دو بند میں شاعرہ نے ہندی کے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن یہ الفاظ دقت فہم نہیں ہیں بلکہ عام قاری جو ہندی سے تھوڑی بہت بھی شد بد رکھتا ہو، وہ بہ آسانی اس کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ رن بھومی (میدان جنگ) جل (پانی) چھایا (عکس) چٹے ہونا (بالکل سفید ہونا) کھال (جسم کی جلد) جیسے الفاظ ہندی زبان کے ہیں۔ ہندی الفاظ کی آمیزش کے باوجود ان دو بندوں میں بڑی موسیقیت اور سلاست پائی جاتی ہے اور اس میں دوہے کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

'پتھر کی زبان' فہمیدہ ریاض کا اولین شعری مجموعہ تھا، جس کی اشاعت کے بعد ادبی دنیا نے ان کا مخصوص لہجہ اور منفرد طرز اظہار کو محسوس کیا۔ ایک اچھوتا لہجہ اور دلکش اسلوب کے باعث ان کی مقبولیت کا گراف اونچائیوں کو چھونے میں کامیاب ہوا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'بدن دریدہ' عنوان کی مناسبت سے موضوع اور مضامین کی پیش کش کا وسیلہ بنا۔ 'بدن دریدہ' میں فہمیدہ ریاض کے فن کی پختگی ادبی دنیا نے محسوس کی۔ وہ اس موضوع کو اپنی بیشتر نظموں میں مختلف استعاروں اور کنایوں کے سہارے سمونے کی کوشش کرتی رہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ فہمیدہ ریاض اس انداز سخن کا منطقی ثمر ہیں، جس کی آبیاری کشور ناہید کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ایک شعر دیکھتے چلیں جس میں انھوں نے مردوں کو چیلنج کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا ہے کہ:

کس سے اب آرزوئے وصل کریں
اس خرابے میں کوئی مرد کہاں؟

اپنی نظم 'میگھ دوت' میں فہمیدہ نے خود کو 'بنت ہجر' قرار دیا ہے۔ یہ بھی عورت کے جذبات کی ترجمانی کی ایک خوبصورت سبیل ہے۔ شاعرہ نے یہاں وصال کو فراق سے تعبیر کیا ہے اور مدھر ملن کے احساس کو بڑی خوبصورتی سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ 'میگھ دوت' نظم کے آخری چند بندوں پر نظر ڈالیے:

میں بنت ہجر ہوں
مجھ میں ایسی پیاس ہے
میں کہ میرے واسطے
وصال بھی فراق ہے
میگھ رس میں بھیگ کر
ہانپتی کھڑی کھڑی
کہہ رہا ہے دل مرا
یہی ہے
مدھر ملن کی گھڑی

فہمیدہ ریاض اردو کی ان ممتاز شاعرات میں سے ایک تھیں جن کا اپنا باغیانہ تیور اور عالمانہ انداز تھا۔ جن کی شاعری ان مخصوص موضوعات اور مضامین پر مشتمل ہے، جو عبارت ہے عورت کی ذاتیات سے۔ انھوں نے فرسودہ روایات کی زنجیروں کو اکھاڑ پھینکنے کا کام کیا۔ عورت کی حیثیت مرد اساس معاشرے سے تسلیم کرانے کا کام کیا ان کی شاعری میں عورت کے اپنے وجود کا بھرپور احساس نمایاں ہے۔ فہمیدہ ریاض کی عورت دوسروں کے وجود کا سایہ نہیں بلکہ ایک مکمل شخصیت ہے، یعنی اس کی ایک الگ

شناخت ہے۔انھوں نے اپنے دوسرے مجموعۂ کلام 'بدن دریدہ' کے ابتدائی صفحات میں یہ لکھا کہ:

'جب جاں سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں' کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنادیں۔آخری سانس تک جنگ کریں،سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی، میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں،ایک رجز (میدان جنگ میں پڑھے جانے والے اشعار) ہیں، جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری، اس لحاظ سے 'بدن دریدہ' ایک رزمیہ ہے اسے پڑھ کر اگر لوگ چونکے تو کیا برا ہو۔'

عورت کے تقدس اور اس کے احترام کے لیے آواز اٹھانے والی اس شاعرہ نے بڑی جرأت مندی اور دلیری کے ساتھ حق بات کہنے کی کوشش کی۔انھوں نے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے غزل کو نہیں بلکہ نظم کو وسیلہ بنایا۔ان کی شناخت ایک نظم گو شاعرہ کی حیثیت سے مسلم ہے، حالانکہ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں،لیکن ان کی تخلیقات کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ان کی نظموں کی ایک طویل فہرست ہے، جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ان کی نظموں کے عنوانات ہی بتا دیتے ہیں کہ اس اجمال کی تفصیل کیا ہوگی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے فہمیدہ کی چند نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی فنی ہنرمندی کا مختصر اسہی مگر ایماندارانہ احاطہ کیا ہے:

'پتھر کی زبان' کے بعد دوسرے مجموعۂ کلام 'بدن دریدہ' میں فہمیدہ ریاض نے نہ صرف فنی پختگی کا ثبوت دیا بلکہ اس کا محبوب موضوع اپنی تمام جزئیات سمیت مزید نکھر کر سامنے آ گیا اور وہ ہے جنسی پیاس۔اس نے نظم 'میگھ دوت' میں خود کو 'بنت ہجر' قرار دیا۔ سو بیشتر منظومات جنسی ملاپ کی مدھر گھڑیوں اور سرور کے لمحات سے لے کر حمل، ماں بننے اور لوری تک سب کچھ واضح الفاظ، واضح امیجز اور واضح علامات میں بیان کیا گیا۔اس ضمن میں یہ نظمیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔'برف باری کی رات'، 'میگھ دوت'، 'باکرہ'، 'لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا'، 'بدن دریدہ'، 'عشق تم جس کی تمنائی تھیں'، 'وصل اک کرن بن کر'، 'زبانوں کا بوسہ'، 'ابد'، 'نذر فراق' پہلی بار فہمیدہ ریاض کی نظموں میں عورت کے حوالے سے جنسی فعل کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ واضح بھی ہے اور sensuous بھی، لیکن اس میں فاشی اور ابتذال نہیں۔ بحیثیت مجموعی فہمیدہ ریاض کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تشنگی کمی کی نہیں بلکہ وفور کی پیدا کردہ ہے۔'

(اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، کتابی دنیا دہلی 2005،صفحہ 607-606)

احمد ندیم قاسمی کے رسالہ فنون میں محض پندرہ برس کی عمر میں فہمیدہ کی پہلی نظم شائع ہوئی اور صرف 22 سال کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آ گیا۔متعدد شعری مجموعے 1982 سے 2002 کے درمیان منظر عام پر آتے رہے اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ان کا کلیات 'سب لعل و گہر' کے عنوان سے 2011 میں شائع کیا۔فہمیدہ کو متعدد انعامات سے نوازا گیا جن میں ہمت سہیل معین ایوارڈ (2017) المفتاح ایوارڈ (2005) پریسیڈنشل پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ (2010) ستارۂ امتیاز (2010) اور شیخ ایاز ایوارڈ برائے ادب شامل ہیں۔ریاض نے غزلیں بھی کہی ہیں،لیکن ان میں بھی وہی باغیانہ رنگ اور احتجاج کا آہنگ نظر آتا ہے۔

ایسی تخلیق کار جس نے ہندوستان اور پاکستان کو بہت قریب سے دیکھا جس نے دو ملکوں کو فرقہ پرستی کے عفریت میں گرفتار پایا۔اس نے بہت ہی تلخ لہجے میں اپنے درد کو اپنی نظموں میں بیان کیا۔بہت ہی دلیری اور جرأت مندی سے اپنے نظریات اہل علم و دانش کے سامنے پیش کیے۔ایسی مصنفہ جس نے کم و بیش 15 کتابیں شاعری اور فکشن کے حوالے سے تصنیف کیں، اس نے دونوں ملکوں کی خواتین کی حالت زار پر آنسو بہائے اور ان آنسوؤں کو اپنی تخلیقات کا جامہ پہنایا اور یہ بتا دیا کہ عورت بھی مردوں کی طرح تمام حقوق کی حقدار ہے۔اس کے ساتھ ناانصافی درست نہیں۔ایسی شاعرہ جس نے اپنے کلام کے ذریعہ صنف نازک کی دبی خواہشوں، نفسانی جبلتوں اور شہوانی کیفیتوں کو کھل کر بیان کیا اور یہ بتا دیا کہ وہ جذبات ہیں جن میں شریک سبھی ہوتے ہیں لیکن عورت کی زبان سے سننے کے روادار نہیں ہوتے۔فہمیدہ نے خواتین کے ساتھ روا جبر، استحصال، نابرابری، جنسی تفریق اور فرسودہ روایات کے خلاف آواز بلند کی۔عورت کے تقدس، احترام اور اس کے مقام کے لیے زندگی بھر لڑتی رہیں۔غزل عورتوں سے بات کرنے کا نام ہے لیکن فہمیدہ نے عورتوں کی بات کرنے کے لیے شاعری کی اور غزل پر نظم کو ترجیح دی کیونکہ نظم کا کینوس بہت کشادہ ہوتا ہے اس میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔تخلیقی زبان سے عورتوں کی باتیں کرنے والی اس شہرۂ آفاق شاعرہ کی سانس 22 نومبر 2018 کو ایسی رکی کہ پھر وہ کسی کی بات کسی سے نہ کرسکیں۔□□

Sabir Ali Siwani
H. No. 9-4-87/C/12 First Floor
Behind Moghal Residency
Toli Chowki, Hyderabad-500008 (T.S)

نظمیں

فہمیدہ ریاض

قطرہ قطرہ

قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں

اک آنسو اُس شخص کا، جو بیگانہ ہے
اک آنسو اُس نام کا جو ہم لے نہ سکے
اک آنسو اُس دعا کا جو پوری نہ ہوئی
ایک فضول سی بات کہ جو بے سود کہی
آنسو میرا خواب میں جس سے گھبراؤں
آنسو میری مُراد جسے میں بہلاؤں
اک آنسو اُس چہرے کا جو یاد رہے
آنکھوں کے رستے جو دل میں اُتر جائے
اک آنسو اُس ٹھہرے ٹھہرے لہجے کا
اک آنسو اُس وہم کا ذہن میں جو آیا
اک آنسو اُس جھوٹ کا جو اوروں سے کہا
پھیکی ہنسی سے کیسے قصہ ختم کیا
لمحہ لمحہ رات گزرتی جاتی ہے

قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں

اندیشہ

ہاتھ میں بجتی بات کی لرزش
لاکھ بچاؤں ، کھٹکے برتن
گھٹتی گھٹتی مجبوری میری
سب کے طعنے، دل کی کھولن
امیدوں کی راکھ میں دہکیں
جلتی حسرت کے انگارے
رخ پر ڈھلکے عرقِ ندامت
کہنا چاہوں ، چپ رہ جاؤں
ہائے اس کی کھوئی محبت
گال پہ کاجل پھیلا پھیلا
محرومی سے اُجڑی صورت
رُسوائی سے آنچل میلا
چپکے چپکے آنسو پونچھوں
نہیں نہیں، میں روتی کب ہوں
اس کا مجھ کو دھیان کہاں ہے
مجھ پر تم اُنگلی نہ اُٹھاؤ
یہ گیلی لکڑی کا دُھواں ہے

جہانِ نسواں

عالم برزخ

یہ تو برزخ ہے یہاں وقت کی ایجاد کہاں
اک برس تھا کہ مہینہ ہمیں اب یاد کہاں
وہی تپتا ہوا گردوں وہی انگارا زمیں
جا بہ جا تشنہ و آشفتہ وہی خاک نشیں
شب گراں زیست گراں تر ہی تو کر جاتی تھی
سود خوروں کی طرح در پہ سحر آتی تھی
زیست کرنے کی مشقت ہی ہمیں کیا کم تھی
مستزاد اس پہ پروہت کا جنون تازہ
سب کو مل جائے گناہوں کا یہیں خمیازہ
ناروا دار فضاؤں کی جھلستی ہوئی لو!
محتسب کتنے نکل آئے گھروں سے ہر سو
تاڑتے ہیں کسی چہرہ پہ طراوت تو نہیں
کوئی لب نم تو نہیں بشرے پہ فرحت تو نہیں
کوچہ کوچہ میں نکالے ہوئے خونی دیدے
گرز اٹھائے ہوئے دھمکاتے پھرا کرتے ہیں
نوع آدم سے بہر طور ریا کے طالب
روح بے زار ہے کیوں چھوڑ نہ جائے قالب
زندگی اپنی اسی طور جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سوچ

رات اک رنگ ہے اک راگ ہے اک خوشبو ہے
مہرباں رات مرے پاس چلی آئے گی
رات کا نرم تنفس مجھے چھو جائے گا
دودھیا پھول چنبیلی کے مہک اٹھیں گے
رات کے ساتھ مرا غم بھی چلا آئے گا
اب مرے خانۂ دل میں بھی چراغاں ہوگا

یونہی ہر شب جو پگھلتی ہے سیاہی شب کی
اک لرزتا ہوا سایہ سا چلا آتا ہے
جس کے سینے میں دھڑکتا ہے طلائی مہتاب
رات کے پیار میں گم ذہن اگر یہ پوچھے
کون ہو تم مرے مہمان اندھیرے میں چھپے
چار اطراف بکھرتے ہوئے سناٹے میں
میرے افکار یونہی گونج کے رہ جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے نہیں اور کوئی بھی موجود
بے کراں رات میں گھل جاتا ہے خود میرا وجود

ڈاکٹر ناہید فاطمہ

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

گورنر جنرل مارکوئیس ویلزلی کے عہد اقتدار تک انگریزوں نے ہندوستانی یا فارسی زبانوں کو باقاعدہ طور پر سیکھنے سکھانے کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ ہندوستان میں ملازمت کی غرض سے آنے والے انگریز حکام یہ زبانیں یا تو انگلینڈ سے سیکھ کر آیا کرتے تھے یا پھر ہندوستان آکر ذاتی طور پر کسی منشی کی خدمات حاصل کر کے ان زبانوں کو سیکھ لیا کرتے تھے۔اس بات کو سمجھنے میں انگریز حکام کو تھوڑا وقت لگا کہ مقامی زبانوں کو سیکھے بغیر ہندوستان میں حکومت کا نظام چلانا ایک دشوار کام ہے۔ چنانچہ اس کمی کو دور کرنے کی غرض سے 1800 میں گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے اپنے مشیروں اور کمپنی کے آقاوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود نووارد انگریز ملازموں کو ہندوستانی زبان سکھانے کی غرض سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کالج ایک ایسے ادارے کی شکل میں ابھرا جس نے بہ یک وقت اردو زبان و ادب کو فائدہ بھی پہنچایا اور نقصان بھی۔ یہاں ایک طرف اردو اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں پلتی رہیں تو دوسری جانب یہاں اردو ادبیات بالخصوص نثر نگاری کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا جاتا رہا۔ صاحب ارباب نثر اردو لکھتے ہیں:

> ’لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنے تدبر و دانش مندی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب فارسی ہندوستان کی زبان نہیں رہی اور یہاں کی ملکی زبانوں میں صرف ہندوستانی یعنی اردو ہی ایک ایسی بسیط زبان ہے جو ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس حقیقت کے معلوم ہوجانے کے بعد دوسرا کام اس زبان کی ادبیات فراہم کرنے کا تھا۔ اردو کا سارا ذخیرہ صرف شعرو شاعری تک محدود تھا۔ نثر سرے سے مفقود تھی اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ علوم کی کتابیں موجود ہی نہ تھیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک سررشتہ تالیف وتراجم قائم کیا گیا اور اطراف ملک سے قابل افراد کو چن کر کلکتے میں ایک جامعہ قائم کیا گیا اور ان سے اردو نثر میں کتابیں لکھائی جانے لگیں۔‘(ارباب نثر اردو، مولوی سید احمد، صفحہ 15-14)

اس کالج کے وجود میں آنے سے پہلے اردو زبان میں نثر کی جانب کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ اس عہد تک اردو میں نثر کا سرمایہ محض چند ذاتی نوعیت کے خطوط، صوفیوں کے مواعظ اور فارسی و اردو شعرا کے تذکروں پر مشتمل تھا۔ بغور دیکھیں تو اس عہد تک اس زبان یعنی اردو (ہندی، ہندوی، ریختہ) کو ہی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اکثر لوگ اسے بازاری زبان کہا کرتے تھے۔ اس کے مقابل فارسی زبان کو اشرافیہ کی زبان تصور کیا جاتا تھا اور اسے ہی اعلیٰ اور معیاری

> ”فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہی چونکہ نووارد انگریز ملازمین کو ہندوستانی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج سے روشناس کرانا تھا، اس لیے اس کام کے لیے انہوں نے عوام میں مقبول اور سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہندوستانی (ہندی، ہندوی، ریختہ) کا انتخاب کیا“

زبان سمجھا جاتا تھا۔اس ماحول میں بھی اس زبان سے وابستہ کچھ لوگ اردو کو حقارت کی نظر سے دیکھے جانے کے نہ صرف مخالف تھے بلکہ اس کے برعکس وہ اس بات کو بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ آنے والے وقت میں یہ عوامی زبان ہی علم و ادب کا معیار تصور کی جائے گی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہی چونکہ نووارد انگریز ملازمین کو ہندوستانی تہذیب وتمدن اور رسم و رواج سے روشناس کرانا تھا، اس لیے اس کام کے لیے انھوں نے عوام میں مقبول اور سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہندوستانی (ہندی، ہندوی، ریختہ) کا انتخاب کیا۔ کالج کے ہندوستانی شعبہ کے صدر اور پروفیسر جان بارتھ وک گل کرسٹ نے، جنھیں ہندوستانی زبان سے خصوصی دلچسپی تھی، اس کی جانب مزید توجہ کی اور اپنی کاوشوں سے اردو ادب کو مالامال کیا۔

"ایک زاویے سے دیکھا جائے تو اردو نثر کی جو شکل وصورت آج متعین ہو چکی ہے اس کی صورت گری میں گل کرسٹ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ انہیں کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو ایک ترقی یافتہ زبان کے طور پر ساری دنیا میں جانی جاتی ہے"

جان بارتھ وک گل کرسٹ (1759 تا 1848) کا شمار اردو کے بڑے محسنین میں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اردو جیسی زبان سے، جو اس وقت سارے ہندوستان میں رابطے کی زبان ہوا کرتی تھی، اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ اس زبان میں جس میں ترقی کے سارے امکانات موجود ہیں، لکھنے والوں نے نثر کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں کی تو انھوں نے اس کی کمی کو پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ ایک زاویے سے دیکھا جائے تو اردو نثر کی جو شکل وصورت آج متعین ہو چکی ہے اس کی صورت گری میں گل کرسٹ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ انھیں کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو ایک ترقی یافتہ زبان کے طور پر ساری دنیا میں جانی جاتی ہے۔ گل کرسٹ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع اللہ لکھتے ہیں:

> 'گل کرسٹ کا شمار بجا طور پر اردو کے محسنین میں کیا جاتا ہے۔ یہ اسی کی جگر کاوی اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے کہ اردو نثر جو صدیوں سے جمود و تعطل کا شکار تھی، ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا۔ اس کے علاوہ زراعت وتجارت سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اگر وہ چاہتا تو کاشت کاری، تجارت اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے ذریعے کافی دولت کما کر عیش و عشرت اور طرب و نشاط کی زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن ان تمام مفادات کو پس پشت ڈال کر اس نے جس لگن کے ساتھ ہندوستانی زبان و ادب کی خدمت اور ترویج و ترقی کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا، وہ اس کا ایک انتہائی قابل ستائش کارنامہ ہے۔'

(فورٹ ولیم کالج، ایک مطالعہ، ڈاکٹر سمیع اللہ، صفحہ 96)

جان گل کرسٹ کی پیدائش 1759 میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرا میں ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر انھیں فن طب سے دلچسپی تھی۔ دوسرے انگریزوں کی طرح جو اس عہد میں اپنی بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے جوق در جوق ہندوستان آ رہے تھے، وہ بھی تلاش معاش میں 1772 میں ہندوستان آیا۔ یہاں آنے کے بعد اس کا تقرر ممبئی میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کیا گیا۔ اس دور اندیش انگریز نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ اگر ہندوستان میں رہ کر ترقی کی امید کرنا ہے تو یہاں کی عوامی زبان سے خاطر خواہ واقفیت نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے اس وقت ہندوستان میں رائج سب سے بڑی زبان جسے اس نے ہندوستانی کا نام دیا تھا، سیکھنے کی جانب خصوصی توجہ صرف کی۔ گل کرسٹ نے خود ہندوستانی زبان سے اپنی دلچسپی کا اعتراف اپنی کتاب The Appendix میں اس طرح کیا ہے:

> '1772 میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت نہ تو میرے ہی لیے خوش گوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کر لوں۔ جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے، چنانچہ اس زبان کو جسے اس زمانے میں مورس (Moors) کہتے تھے، سیکھنے کے لیے جم کر بیٹھ گیا۔'

(بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد، عتیق صدیقی، صفحہ 41-40)

گل کرسٹ نے پوری محنت اور لگن سے ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول اس زبان کا علم حاصل کیا جسے بعد میں اردو کے نام سے

جانا گیا۔ انگلینڈ سے ہندوستان آنے والا یہ پہلا شخص تھا جس نے اس زبان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستانی زبان کو سیکھنے کے دوران اسے اس زبان میں قواعد کی کسی کتاب اور لغت کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ دراصل کسی زبان میں اہل زبان کو قواعد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ اس کے بغیر بھی فطری طور پر صحیح اور غلطیوں سے پاک زبان بولنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اس کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جو کسی دوسری زبان کے توسط سے نئی زبان سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے اس وقت تک اگر اردو میں قواعد کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ گل کرسٹ انگریز تھا، انگریزی زبان کا تعلق جس لسانی خاندان سے تھا، اس کا ہندوستانی سے کوئی رشتہ نہیں تھا، اس زبان کو سیکھنا تھا، اس لیے اسے ایسی کسی کتاب کی ضرورت تھی، جو اس کی رہنمائی کر سکے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی کتاب اس وقت تک اردو میں موجود نہیں تھی۔ اس کے لیے اسے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے پہلی فرصت میں ہندوستانی قواعد اور لغت ترتیب دینے کا مضبوط ارادہ کر لیا:

'ہندوستان کے دوران قیام میں اپنا بیشتر وقت میں نے ہندوستانی زبان کی تحصیل میں صرف کیا ہے۔ اس زبان میں اب میں نے اتنی دست گاہ حاصل کر لی ہے کہ اس کی قواعد و لغت مرتب کرنے کا کام میں نے اس پیمانے پر شروع کیا ہے کہ اب تک کسی اور نے اتنے وسیع پیمانے پر نہیں کیا ہے۔' (بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد، عتیق صدیقی، صفحہ 43)

آخر کار کئی مہینوں کی مسلسل ریاضت اور سخت کاوش کے بعد 1796 میں یہ قواعد زبان منظر عام پر آ گئی۔ اس کے بعد 1798 تک جان گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کی قواعد و لغت پر مزید چار کتابیں لکھیں۔ جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے۔ ان کارناموں کی بدولت ان کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور اسے ہندوستانی زبان کا انگریز ماہر تسلیم کیا جانے لگا۔

ہندوستانی زبان میں گل کرسٹ کی ماہرانہ دسترس کی شہرت لارڈ ویلزلی تک اس وقت پہنچی، جب انھیں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ نو وارد انگریز ملازمین کو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے اور اس کے ذہن میں ایک ایسا کالج کھولنے کا خواب پرورش پا رہا تھا، جہاں اس کی تعلیم کا نظم ہو۔ چنانچہ جب انھوں نے گل کرسٹ کے بارے میں سنا تو اس کو طلب کیا اور اسے انگلینڈ سے آنے والے نو وارد انگریزوں کی تعلیم کی ذمہ داری سونپ دی۔ ان نو وارد ملازمین کی درس و تدریس کے تعلق سے ایک ادارہ اورینٹل سیمی نری کے نام سے وجود میں آیا جسے بعد میں گل کرسٹ کے مدرسے کے نام سے بھی پہچانا گیا۔ گل کرسٹ کے اس سیمی نری کو ہم آسانی سے فورٹ ولیم کالج کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔

جب ویلزلی کی ایما پر 10/ جولائی 1801 میں فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل ڈالی گئی تو اس کے شعبہ ہندوستانی کی سربراہی کے لیے گل کرسٹ سے مناسب کوئی دوسرا انگریز شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اسے شعبہ ہندوستانی کا صدر اور پروفیسر نامزد کیا گیا اور وسیع اختیارات

کے ساتھ اس شعبے کی تمام تر ذمہ داری اس کے سپرد کردی گئی۔ لیکن جب عملی طور پر نو وارد انگریزوں کو درس و تدریس دینے کا وقت آیا تو گل کرسٹ کو ہندوستانی زبان میں جو کتابیں ملیں وہ یا تو اتنی مشکل زبان میں تھیں کہ انھیں ایسے لوگوں کو پڑھانا جنھوں نے ابھی اس نئی زبان کی شد بد حاصل کی ہو مشکل تھا یا جن سے ہندوستانی تہذیب و تمدن پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی تھی۔ اسے اردو میں نثر کی کتابوں کی کمی کا شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ اس کے سامنے کوئی بھی ایسی کتاب موجود نہ تھی، جو آسان زبان میں ہو اور جس کی مدد سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ اس کمی نے گل کرسٹ کو متعدد درسی نوعیت کی کتابوں کی تیاری اور اشاعت پر مجبور کیا، جو یا تو اس نے خود بھی لکھیں یا پھر سارے ہندوستان سے اس کام کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے لکھوائیں۔ اپنی ان سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے 12/جنوری 1802 کو کالج کونسل کو بھیجے گئے ایک خط میں گل کرسٹ نے لکھا:

> 'ہندوستان میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں ہے جس سے تھوڑی بہت بھی مدد لی جا سکے۔ اس لیے مجھے حسب ذیل کتابیں مختلف شرح پر چھاپنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اس کام کے لیے میں نے کلکتے کے تقریباً سبھی چھاپہ خانوں کی مدد حاصل کر لی ہے تاکہ کم وقت میں ہم اپنے گوہر مراد کو حاصل کر سکیں۔'

(فورٹ ولیم کالج، ایک مطالعہ، ڈاکٹر سمیع اللہ، صفحہ 41)

1804 میں کالج کو اپنی بیش بہا صلاحیتوں سے نوازنے کے بعد گل کرسٹ نے جیسا کہ مشہور ہے، بیماری کی وجہ سے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن اس استعفیٰ کا سبب دراصل وہ مخالفتیں تھیں جو کمپنی کے آقاؤں کی جانب سے شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ 24/فروری 1804 کو کالج کونسل نے گل کرسٹ کا استعفیٰ منظور کرتے ہوئے لکھا:

> 'مسٹر گل کرسٹ نے جس جوش و خروش، لیاقت و قابلیت اور ان تھک محنت کے ساتھ ہندوستانی زبان کے پروفیسر کی خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف کرنا کالج کونسل اپنا فرض سمجھتی ہے۔ نیز اس کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ گل کرسٹ کی تصانیف نے اور ہندوستانی زبان کی ان کتابوں نے جو انھوں نے چھاپی ہیں، کالج کے قیام کے مقاصد کو بدرجہ اتم پورا کیا ہے۔'

(گل کرسٹ اور اس کا عہد، عتیق صدیقی، صفحہ 165)

جان گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کی بنیاد پر جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں سے کچھ اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

1. A Dictionary of English and Hindoostanee
2. A Grammer of the Hindoostanee Language
3. The Appendix
4. The Oriental Linguist
5. The Anti Jorganist
6. A New Theory and Prospectus of Persian Verbs
7. Hindee Exercises
8. Strangers East India Guide to the Hindoostanee or Grand Popular Language of India.
9. The Hindoostanee Directory of Student Introducter
10. The Hindoostanee Principles
11. The Hindoostanee Manual or Casket of India
12. The Hindee Arabic Mirror
13. The Hindee Moral Preceptor
14. Oriental Fabalist
15. Dialogues, English and Hindoostanee

گل کرسٹ وہ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستانی زبان میں نثر کی جانب سنجیدگی سے توجہ کی تھی۔ اس سے پہلے اسے بازاری اور کم مرتبہ زبان سمجھا جاتا تھا۔ گل کرسٹ نے اس زبان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ یہ فارسی جیسی معیاری زبان سے مقابلہ کرنے لگی۔ اس کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ناموافق حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی ہمت، لگن اور ان تھک کوششوں کی بدولت ہی اردو ادب اتنا وسیع ہو پایا۔

□□□

Dr. Nahid Fatima
Care of Prof. Yaqoob Yawar,
S-2/410/A-1-K, Tabeer, Sikraul,
Patrakarpuram Colony, Gilat Bazar,
Varanasi.221002 (U.P)

تانیثیت، خواتین فکشن نگار اور عورتوں کے مسائل

شاہین بیگ

تانیثیت (Feminism) ایک ایسی تحریک ہے، جس کے زیر اثر خواتین کی زندگی کے گوناگوں مسائل کو منظر عام پر لانے کی سعی کی جاتی ہے۔اس کا اصل مقصد عورتوں کے حقوق کی بازیافت ہے۔تانیثیت مغربی ممالک میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ یہ تحریک یوروپ سے ہندوستان پہنچی۔آج ہمارے ملک کے مختلف زبان وادب پر اس تحریک یا نظریے کے گہرے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ویسے تو اردو ادب میں تانیثیت تحریک کی شکل اختیار نہ کرسکی، اس کی کئی اہم وجوہات ہیں۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس نظریے کو یکسر نظر انداز نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہی طبقۂ نسواں کے مسائل شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو زبان وادب میں اپنی جگہ بنانے لگے تھے۔

اردو ادب بالخصوص اردو فکشن پر تانیثیت کا گہرا عکس ملتا ہے۔ داستانوں کے برعکس ناول میں عورت کو ایک نئی زندگی ملی۔اسے سماج کے ایک جیتے جاگتے کردار کے بطور پیش کیا گیا۔قلم کاروں نے طبقۂ نسواں کی پسماندگی اور زبوں حالی کو موضوع بحث بنایا۔اردو ناول میں اس کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔مرد ناول نگاروں کے شانہ بہ شانہ خواتین ناول نگاروں نے بھی صنف نازک کے داخلی اور باطنی حالات و کوائف کو اپنے ناولوں میں اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

تاریخ شاہد ہے کہ مرد ناول نگاروں کے یہاں پہلے پہل تانیثیت کے خدوخال ملنے شروع ہوتے ہیں لیکن اردو ناول نگاری کو صحیح معنوں میں تانیثی فکر وشعور سے ہم آہنگ کرنے میں خواتین فکشن نگاروں نے ایک منفرد رول ادا کیا۔''انگارے'' (1932) کے ذریعہ اردو فکشن میں جو چنگاری پیدا ہوئی تھی، اسے شعلہ صفت بنانے میں خواتین کی حصہ داری زیادہ رہی ہے۔ ہر چند کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ اردو ادب کو ایک نئی روشنی ملی۔فکر وشعور کی انقلابی جہت سامنے آئی۔تاہم اس اہم موڑ کے قبل سے ہی اردو ناول میں سماجی حقیقت نگاری کے نقوش نمایاں ہونے لگے تھے۔اس عہد میں بھی چند ایسی خواتین ناول نگار نظر آتی ہیں جنھوں نے طبقۂ نسواں کی زندگی کے نازک اور سنجیدہ مسائل کو گویائی عطا کی۔اکبری بیگم، محمدی بیگم، عباسی بیگم، نذر سجاد حیدر، صالحہ عابد حسین اور صغرا ہمایوں بیگم اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

مذکورہ بالا خواتین قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ عورتوں کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں کو روشن کیا۔اس عہد کے ناولوں میں مذہب کے پس پردہ طبقۂ نسواں پر ڈھائے جا رہے ظلم و زیادتی اور جبر وتشدد کو حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کیا گیا۔''گدڑی کا لال'' (اکبری بیگم)، ''سرگزشت ہاجرہ'' (صغرا ہمایوں مرزا)، ''شریف بیٹی'' (محمدی بیگم) اور ''آہ مظلوماں'' (نذر سجاد) جیسے ناولوں میں عورت کے درد والم کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ان ناولوں میں عورت ہر جگہ درد وغم سے نڈھال نظر آتی ہے۔مذکور بالا ناولوں میں بے جا و بے بنیاد مذہبی پابندی، شادی بیاہ، طلاق، جہیز اور پردہ جیسے سنجیدہ مسائل زیر بحث ہیں۔ان ناولوں کے بعض نسوانی کردار جدوجہد، خود اعتمادی اور خود کفالتی کی علامت بن گئے ہیں۔ ''گدڑی کا لال'' کی ہیروئن ثریا کی روشن خیالی پر اظہار خیال کرتے ہوئے صغرا مہدی نے لکھا ہے:

> ''ثریا جیسی جو تعلیم یافتہ لڑکی ہے، وہ شادی کے موضوع پر کھل کر بات چیت کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ کس قسم کے شوہر کو پسند کرتی ہے۔''

(صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت (2002)، سجاد پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ص:95)

ترقی پسند تحریک اردو کی ایک بااثر ادبی تحریک رہی ہے۔اس تحریک کے زیر اثر حقیقت پسندی اور روشن خیالی کا ایک نیا تصور سامنے آیا۔ تانیثیت کے چند اہم مسائل بھی اس تحریک کے فکری دھارے میں شامل ہوئے۔اردو ناول میں طبقۂ نسواں کی زندگی کے داخلی اور ظاہری حالات و مسائل کا بے باکانہ تخلیقی اظہار ہوا۔عورتوں کے سماجی، سیاسی، اقتصادی،

''اردو ناول میں طبقۂ نسواں کی زندگی کے داخلی اور ظاہری حالات و مسائل کا بے باکانہ تخلیقی اظہار ہوا۔ عورتوں کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، جنسی اور نفسیاتی صورت حال کی نئی نئی تعبیریں شروع ہوئیں۔ مرد اساس سماج کے جبر و تشدد، سماجی ناہمواریوں، قدامت پرستی، طبقاتی کشمکش، توہم پرستی اور فرسودہ روایات پر کھل کر چوٹ کی جانے لگی،،

تعلیمی، جنسی اور نفسیاتی صورت حال کی نئی نئی تعبیریں شروع ہوئیں۔ مرد اساس سماج کے جبر و تشدد، سماجی ناہمواریوں، قدامت پرستی، طبقاتی کشمکش، توہم پرستی اور فرسودہ روایات پر کھل کر چوٹ کی جانے لگی۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت قائم کرنے والوں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، صغرا مہدی اور رضیہ فصیح وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان ناول نگاروں کے یہاں تانیثی شعور زیادہ پختہ نظر آتا ہے۔ یہ شعور کہیں کہیں للکار اور چیخ و پکار کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے۔

اردو فکشن کی دنیا میں عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے تانیثی فکر و نظر اور شدت پسندی کے باعث مشہور ہیں۔ یہ شدت پسندی ان کے ناول اور افسانے دونوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے خواتین کے سماجی، سیاسی، تعلیمی، بالخصوص جنسی اور نفسیاتی مسائل شدت پسندی اور گہرائی کے ساتھ پیش کیے۔ ان کی تخلیقی کائنات تانیثی فکر سے آباد ہے۔ افسانہ 'لحاف' (1946) میں یہ شدت صاف جھلکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان پر مقدمے بھی چلے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مردذات کی بالادستی اور اس کی چیرہ دستیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں ہم جنسیت (Lesbianism) بھیانک روپ اختیار کر گئی ہے۔ ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور افسانہ ''لحاف'' اس کے بین ثبوت ہیں۔ ان کے یہاں یہ نازک اور سنجیدہ مسئلہ سماجی ردعمل کے طور پر ابھرتا ہے۔ ان کے ناولوں کے بعض نسوانی کردار ایک احتجاج کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن اور ''ضدی'' کی آشا اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ شمن قدم قدم پر سماجی ناہمواریوں سے ٹکراتی ہے تو آشا طبقاتی کشمکش کے خلاف اپنی جان دے دیتی ہے۔ شمن اپنے حقوق کی پامالی اور مرد کی ناانصافیوں کے خلاف لڑنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی ہے۔ دراصل ان نسوانی کرداروں کے عمل پیہم کے پس پردہ مصنفہ کے تانیثی فکر و احساس کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے دوسرے اہم ناول ''معصومہ'' میں بھی یہی فضا ملتی ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن مرد ذات کی زیادتیوں سے تنگ آکر نہایت غصے میں کہتی ہے:

''ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بھونکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے جو کچھ ہو تمہارے فریب کا حال ضرور لکھوں گی۔ اس طرح دھوکہ دے کر تم بھاگ نہیں سکتے۔ اس کا انجام سوچ لینا۔''

(عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر (2006)، کتابی دنیا، دہلی، ص: 291)

ناول ''معصومہ'' کی ہیروئن معصومہ اپنے باپ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کی وجہ سے طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا یہ قدم مرد اساس معاشرے کے لیے عبرت ناک ہے۔ عصمت نے اس کردار کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ معصومہ کا سودا کرتے وقت اس کی ماں کہتی ہے:

''فلیٹ بچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔ لڑکی بغیر ان کی مرضی سے رات کو باہر نہیں رہے گی''

(عصمت چغتائی، معصومہ (1946)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص: 22)

مذکورہ بالا اقتباسات سماج اور معاشرے کی تلخ اور کڑوی سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا یہی تانیثی رویہ انھیں دوسرے ناول نگاروں سے الگ کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں عورت کی بے بسی اور لاچاری جھلکتی ہے۔ ان کے تانیثی فکر و نظر کے زاویے دوسرے قلم کاروں سے ذرا مختلف ہیں۔ انھوں نے طبقۂ نسواں کی زبوں حالی کو زماں و مکاں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناولوں میں عورت کے استحصال، جلاوطنی، تنہائی، اور ہجرت جیسے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے خواتین کی مجروح روح اور ان کی نفسیاتی و جنسی پیچیدگی کو تنہائی و جلاوطنی کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موضوعاتی سطح پر ان مسائل کے ڈانڈے تانیثی نظریے سے جا ملتے ہیں۔ بقول ابوالکلام قاسمی:

''قرۃ العین حیدر نے عورت کے مقدر، اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو ترجیحی طور پر اپنا موضوع بنایا۔ اس رویے کو اگر

ہم کسی شعوری کوشش کا نام نہ بھی دیں تب بھی اس رویّے کے نتیجے میں سامنے آنے والے اس خام مواد کی قدر و قیمت Feminist Trend کے نقطہ نظر سے متعین کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں''

(ابوالکلام قاسمی، تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر، شعور حکمت (سہ ماہی)، حیدرآباد، ص:67)

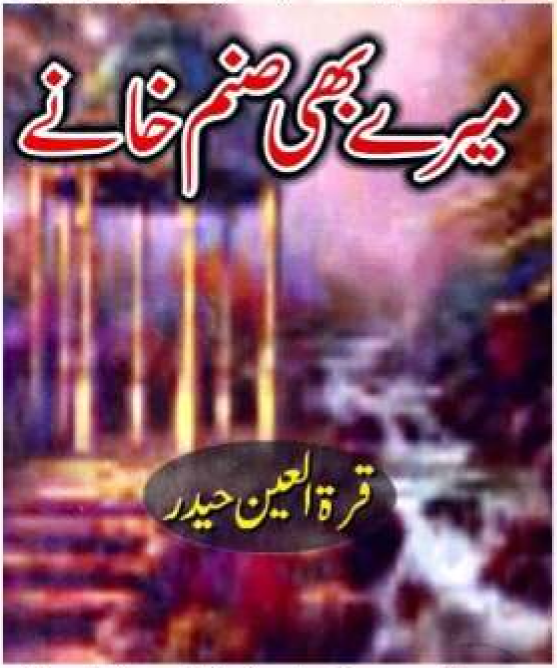

یہ اقتباس مصنفہ کے ناولوں کے تانیثی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ان کے ناولوں کی اکثر و بیشتر خواتین زمانے کی ستم ظریفیوں اور چیرہ دستیوں کا شکار ہوتی ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ، ''سیتاہرن'' کی سیتا میر چندانی، ''آگ کا دریا'' کی چمپا، ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کی ثریا حسین، ''آخرشب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار وغیرہ اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔یہ تمام کردار کسی نہ کسی صورت میں بے بسی، لاچاری، تنہائی اور احساس محرومی سے دوچار ہیں۔ان میں سے بعض اولاد کی خاطر دکھ سہتی ہیں تو بعض محبوب کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ دکھ، درد، افسوس، زبوں حالی، بے بسی اور خود بیگانگی گویا ان کا مقدر ہے۔اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''ان میں عورت کے مقدر، مرد کے ہاتھوں اس کے استحصال، اس کی خود سپردگی، قربانی اور ذہنی جلا وطنی کے تجربے، بہت موثر اور حقیقت پسندانہ طور پر سامنے آئے ہیں''

(شمیم حنفی، قرۃ العین حیدر، آواز (پندرہ روزہ)، ص:6)

''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول ہے۔ اس ناول کی ہیروئن چمپا خواتین کے دکھ درد، غم و مایوسی اور بے بسی کی علامت بن گئی ہے۔وہ ہر دور میں ایک نئی شناخت اور ایک نئے وجود کے ساتھ نظر آتی ہے۔لیکن اس کے تئیں زمانے کا رویہ نہیں بدلتا۔اس کی قسمت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ گویا درد و غم اس کے وجود کا ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے۔وہ مذہب اور سماج کی فرسودہ روایات، ذہنی غلامی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف لڑتی ہے۔بعض اوقات اس کی حرکت و عمل سے شدت پسندی بھی جھلکتی ہے۔رخشندہ کی روشن خیالی سے مرد اساس سماج کس قدر حیرت زدہ ہے؟ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ارے ہم دوسروں کو کیا کہیں۔۔۔۔۔۔اب تو یہ غضب دیکھو کہ خود ہماری مسلمان عورتیں میدان سیاست میں آ رہی ہیں۔پنجاب اور سرحد میں ان لوگوں نے پچھلے دنوں کیا کیا قیامت نہ اٹھائی۔اللہ اکبر۔کیوں قبلہ آپ کی رائے گرامی اس مسئلے میں کیا ہے؟ مستورات کا میدان سیاست میں اچھل کود مچانا نہایت درجہ معیوب حرکت ہے نا؟ مولانا، مستورات کی گدی میں عقل تو ہوتی نہیں اور ہر چیز میں آج کل اپنی ٹانگ اڑا رہی ہیں۔پھر بعد میں چلائیں گی کہ ہمارے حقوق دو''

(قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے (1960)، مکتبہ لاہور، ص:402)

اس اقتباس سے عورت کے تئیں مرد ذات کی متعصبانہ ذہنیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقی کائنات Radical کے بجائے Liberal Feminism کی پاسداری کرتی ہے۔لیکن بعض اوقات ان نسوانی کرداروں کی پیش کش کا انداز مغرب کے Radical Feminism Movement کے رجحان سے میل کھاتا ہے۔

''آنگن'' تقسیم ہند کے تناظر میں سماج کے اس ظالمانہ چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔''آنگن'' کی عالیہ اور چھمی اس نامساعد فضا میں سانس لیتی ہیں۔عالیہ بھی ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن کی طرح ظلم اور استحصال کی آگ میں جھلستی ہے۔دونوں مرد کی بالادستی کو چیلنج کرتی ہیں۔یہی ان کی زندگی کا المیہ ہے۔''

اہم ناول نگار خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' میں بھی

صنف نازک کے ذہنی کرب، داخلی گھٹن، بے بسی اور احساس محرومی کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ ''آنگن'' تقسیم ہند کے تناظر میں سماج کے اس ظالمانہ چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ ''آنگن'' کی عالیہ اور چھمی اس نامساعد فضا میں سانس لیتی ہیں۔ عالیہ بھی ''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن کی طرح ظلم اور استحصال کی آگ میں جھلستی ہے۔ دونوں مرد کی بالادستی کو چیلنج کرتی ہیں۔ یہی ان کی زندگی کا المیہ ہے۔ ''زمین'' میں خدیجہ مستور نے بیوہ کی کرب ناک زندگی اور جہیز جیسی سماجی لعنت کو نشانہ بنایا ہے۔ اس ناول میں ایک مظلوم داشتہ تاجی اپنے مالک کی ہوس کا شکار ہوتی ہے۔ آخر کار کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر موت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

جیلانی بانو کے یہاں بھی مرداساس سماج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بے باکانہ تخلیقی اظہار ملتا ہے۔ ''ایوان غزل'' میں جاگیردارانہ طرز معاشرت میں خواتین کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی پسماندگی کی خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔ چاند اور غزل اس ناول کے دو خواتین کردار ہیں۔ ناول میں دونوں کی زندگی کی غم انگیز اور دردناک کہانی بیان کی گئی ہے۔ چاند مردوں کی ہوس کا شکار ہو کر موت کو گلے لگاتی ہے تو غزل بھی جنسی استحصال کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ دونوں درد و غم اور محرومی و مایوسی کی تصویر بن جاتی ہیں۔ ان کے ایک دوسرے ناول ''بارش سنگ'' میں بھی طبقۂ نسواں کی عصمت اور عفت کی پامالی کی المناک کہانی ملتی ہے۔

''جیلانی بانو کے یہاں بھی مرداساس سماج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بے باکانہ تخلیقی اظہار ملتا ہے۔ ''ایوان غزل'' میں جاگیردارانہ طرز معاشرت میں خواتین کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی پسماندگی کی خوبصورت ترجمانی ملتی ہے''

تانیثی مسائل کی پیش کش کے تعلق سے جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ اور صغرا مہدی کے نام بھی اہم ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاش بہاراں'' میں مذکورہ مسائل کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ ناول کی ہیروئن کنول کماری ٹھاکر ایک تغیر پذیر نسوانی کردار ہے۔ اس کی بغاوت اور جدوجہد سماج و معاشرے کے مکروہ چہرے پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ ''راجہ گدھ'' (بانو قدسیہ)، ''راگ بھوپالی'' (صغرا مہدی)، ''انتظار کا موسم'' (رضیہ فصیح احمد) وغیرہ میں بھی خواتین کی شکستہ حال اور افسوس ناک زندگی کی رنگارنگی ملتی ہے۔ ان ناولوں میں اس معاشرے کی عیاشی، فریب کاری، دغابازی، مکاری اور زیادتی کی حقیقت پسندانہ آئینہ داری کی گئی

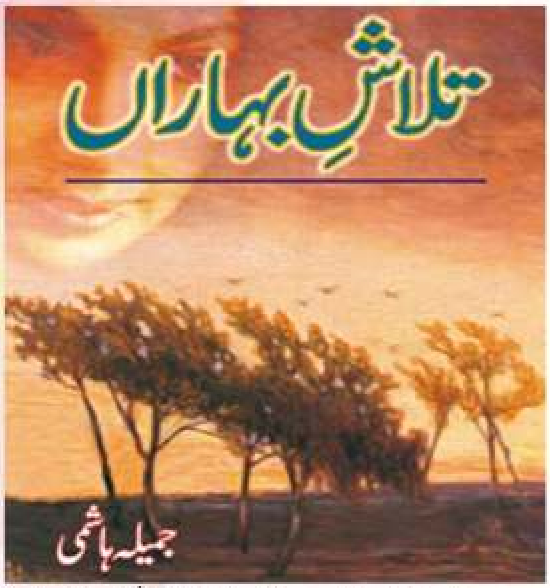

ہے۔ ان ناولوں کے نسوانی کردار معاشرے کو ایک نئی روشنی اور ایک نیا رخ دیتے ہیں۔

آج کی عصری زندگی میں بھی طبقۂ نسواں مصائب اور دکھ درد سے یکسر آزاد نہیں۔ خواتین، آج کے اس تغیر پذیر سماج میں پیدہ شدہ نئے مسائل سے گھری ہوئی ہیں۔ ہم عصر خواتین قلم کار عصری زندگی کے پہاڑ کو اپنے قلم کے تیشے سے کاٹنے میں مصروف ہیں۔ ترنم ریاض اپنے ناول ''مورتی'' اور ثروت خان ''اندھیرا پگ'' میں اپنے تانیثی نظریات و تصورات کی روشنی میں عصری حالات و کوائف سے سروکار رکھتی ہیں۔ ''اندھیرا پگ'' کی ہیروئن روپی، عصمت چغتائی کی شمن اور پیغام آفاقی کی نیرا کی روایت کو جلا بخشتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان ناولوں کے نسوانی کردار اپنی تمام تر کوششوں اور جدوجہد سے طبقۂ نسواں کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں کو منور کرتے ہیں۔ آج کی عصری زندگی نت نئے حالات و مسائل سے دوچار ہے۔ ایسے میں خواتین فکشن نگاروں کو اور زیادہ فعال اور متحرک رہنے کی ضرورت ہے تاکہ ظلم و استحصال کی آندھی رکے اور ایک صحت مند و خوبصورت معاشرہ وجود میں آسکے۔

□□□

Shahin Beg
Upper Primary School
Mudahuwa Dakshini
Shikarganj-Chakia
Dist-Chandauli-232103 (U.P)

رقیہ نبی

عبدالحلیم شرر

تعلیم نسواں کی ایک منفرد آواز

عبدالحلیم شرر پہلے ایسے شخص ہیں جنھوں نے اردو ناول نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ انھوں نے جب 'ملک العزیز ورجنا' لکھا تو یہ اردو کا پہلا تاریخی ناول قرار پایا۔ اس مناسبت سے وہ اردو کے پہلے تاریخی ناول نگار کہلاتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کے علاوہ انھوں نے تقریباً دس معاشرتی ناول بھی لکھے، لیکن ان کے تاریخی ناول ہی ان کی شہرت کا باعث تصور کیے جاتے ہیں۔ اپنے ناولوں بالخصوص معاشرتی ناولوں میں وہ عورت کے کئی مسائل بھی موضوع بحث لائے ہیں۔ خاص کر پردے کی سخت گیری کی مخالفت انھوں نے با آواز بلند کی۔ ناول 'بدرالنساء کی مصیبت' جو اپنے دور کا کافی مقبول ناول ہے، جس میں وہ طبقۂ نسواں میں رائج سخت پردہ کے خطرناک نتائج کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ ناول کی کہانی لکھنؤ کے ایک متوسط درجے کے مسلمان خاندان پر مشتمل ہے۔ جہاں خاندان کے فرزند اختر عسکری کا نکاح ماموں زاد بہن بدرالنساء عرف بدرو سے کرایا گیا ہے۔ چوں کہ بچپن کی شادی کا رواج تھا تو اس سبب سے بعد نکاح وداعی نہیں ہوئی اور جب دونوں سن بلوغ کو پہنچے تو طے ہوا کہ بدرو کے سسر شوکت حسین اسے لانے حیدرآباد جائیں گے۔ رسم پردہ کے سبب ابھی تک شوکت حسین نے بہو کو دیکھا تھا نہ بہو نے اپنے سسر کو۔ بہرحال حیدرآباد سے دونوں لکھنؤ روانہ ہوئے۔ راستے میں قاسم علی خان نامی شخص سے اٹارسی اسٹیشن پر شوکت حسین کی ملاقات ہوئی اور دوران سفر ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر ہی وقت گزارنے لگے۔ قاسم علی خان بھی اپنی بھاوج (جسے شرر 'بہو' نام سے متعارف کراتے ہیں) کو لے کر اپنے وطن فرخ آباد لے جا رہے تھے۔ رسم پردہ کے سبب یہاں بھی دونوں نے ایک دوسرے کی شکل وصورت نہیں دیکھی تھی اور جب گاڑی کانپور پہنچی تو مبادلہ ازدواج عمل میں آیا۔ اس طرح قاسم بھاوج کے بجائے بدرو کو لے کر جاتے ہیں اور شوکت 'بہو' کو لے کر۔ پردہ کی ماری دونوں ہی دلہنیں اس بات سے ناواقف تھیں کہ وہ غلط مقامات پر پہنچا دی گئی ہیں۔ البتہ بدرو کی قسمت اچھی رہی کہ شب زفاف سے پہلے ہی ادلا بدلی کا سانحہ کھل گیا اور وہ اپنے شوہر عسکری کے پاس روانہ کر دی جاتی ہے لیکن بہو کی عصمت لٹنے سے نہ بچ سکی جو دونوں خاندانوں کے بیچ قاتلانہ جنگ کا باعث بنی۔ نتیجتاً بدرو کے شوہر کے ساتھ اور دو لوگوں کی زندگیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ ناول پردہ کی سخت گیری سے متعلق دل دہلانے والا واقعہ بیان کرتا ہے جو یقیناً شرر نے مسلم معاشرے میں پردے کی سخت گیری کی مخالفت میں تحریر کیا ہے۔ بدرالنساء کی مصیبت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ناول ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے۔ لیکن ناول کسی سچے واقعہ پر مبنی ہے یا کسی فرضی کہانی پر، اس پر ہماری بحث نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شرر نے یہاں قدیم روایات کی تقلید کا المیہ بیان کیا ہے کہ جب تک ہم مذہب اور حدیث کے صحیح معنی ومفہوم سے واقف نہیں ہوں گے، مولویوں کی بنی بنائی روایات پر ایمان لانا نہ چھوڑیں گے۔ ہم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ ناول میں اس دور کی خواتین کے لیے یہی پیغام ہے کہ اگر وہ اس طرح اپنی زندگی گزارتی رہیں تو اس جہالت (جسے وہ شرم وحیا کا

نام دے رہی ہیں) کا وہی انجام ہوسکتا ہے جو بدرالنساء کا ہوا۔

شرر کا یہ مختصر ترین ناول پہلے ایک مضمون کی صورت میں رسالہ تعلیم نسواں میں شائع ہوا تھا اور بعد میں یہ ناول کی صورت میں شائع کیا گیا۔ ناول میں شرر نے بے باکی سے مسلمانوں کی پردے سے متعلق لاعلمی اور غلط فہمی کے برے نتائج کو پیش کیا ہے۔ ناول کی اشاعت کے بعد انھیں کافی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھے۔ انھیں اس بات کا علم بہ خوبی تھا کہ سخت پردہ کی پابندی سماج میں عورت کی بدحالی کو مزید بڑھاوا دے رہی ہے۔ پردے کی حمایت میں بولنے والوں سے مذکورہ ناول ہی میں وہ خطیبانہ انداز میں کہتے ہیں کہ وہ پردے کی حمایت کرکے عورتوں کی عزت واحترام کی حفاظت کرنے کے بجائے آوارہ لوگوں کی نظر بد کو ان شریف عورتوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے شہ دیتے ہیں جس سے یہ حفاظت خطرے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ شرر کے ناولوں میں مقصدیت اکثر اوقات حاوی معلوم ہوتی ہے۔ زیر بحث ناول میں بھی ان کا مقصد کہانی پر پوری طرح حاوی دکھائی دیتا ہے اور غالباً اس مقصدیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ وہ ایک خاص مقصد سامنے رکھ کر لکھتے ہیں لہذا ان کے ناول پروپیگنڈہ بن جاتے ہیں۔ بدرالنساء کی مصیبت میں تو وہ کہانی کو چھوڑ کر پردہ کی مخالفت میں باقاعدہ لکچر دینے لگتے ہیں۔''

(سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، سن اشاعت:1960، لاہور، ص68)

سہیل بخاری کے مطابق شرر کے ناول پر بھلے ہی مقصد حاوی رہا ہو لیکن تانیثی نقطہ نظر سے دیکھیں تو انھوں نے خواتین کی اصلاح کو ضروری سمجھنے کے بعد ہی بدرالنساء کی مصیبت جیسا ناول تحریر کیا۔ سماج میں عورت بالخصوص مسلم عورت جس پابندی سے دوچار تھی، اسے دیکھ کر وہ تشویش میں ضرور پڑ گئے ہوں گے۔ اسی لیے بدرالنساء کی مصیبت میں ان کا مقصد دیگر ناولوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بے باکی سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک پردہ خواتین کے لیے ایک قید کی مانند ہے، جس کے سبب وہ دوسرے مذاہب کی عورتوں سے کیا، اپنے ہی مذہب کی عورتوں سے نہیں مل پاتیں۔ اس وجہ سے ان کی اصلاح بھی نہایت دشوار کن عمل معلوم ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم عورتیں دوسرے مذاہب کی عورتوں سے میل جول بڑھائیں تاکہ مختلف قسم کی جانکاریاں حاصل کرسکیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شرر عورت کی چہاردیواری کی زندگی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ سماج میں مرد اور عورت دونوں ہی کو ایک کامیاب مستقبل کے لیے کوشاں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اسی نظریے کے سبب ان کو تحریک نسواں کا حامی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اپنے ایک اور ناول 'غیب داں دلہن' میں انھوں نے شرفا کی عورتوں کی بعد نکاح کی بے بسی کی زندگی کے بجائے، قابل رشک دانشمندی کو پیش کیا ہے۔ ناول میں 'عفت آرا' نامی عورت کا شوہر مرزا مسعود لکھنؤ کی رنگین فضا سے متاثر ہوکر بیشتر پری جمال عورتوں سے تعلقات بڑھاتا ہے۔ 'فیروزہ' نامی عورت سے اس کا زوردار معاشقہ رہتا ہے جس کی صحبت سے دور کرنے کے لیے عفت آرا نہایت عقلمندی سے کئی چالیں چل کر آخرکار اسے صحیح راہ پر لے آتی ہیں۔ وہ شوہر پر اپنا غصہ ظاہر کرتی ہے نہ غم بلکہ وہ فیروزہ کی حقیقت اپنے شوہر کے سامنے لانے کے لیے دانشمندی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس طرح نہ صرف اپنے شوہر بلکہ اپنے رشتے کے دیور 'ذکی' کو بھی فیروزہ کے شر سے بچا لیتی ہے۔ اس کردار سے متعلق ڈاکٹر شریف احمد اپنی کتاب ''عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن'' میں لکھتے ہیں:

> ''......ایک دوراندیش' ذہین اور پاک باز عورت اگر سمجھ سے کام لے تو بھٹکے ہوئے شوہر کو راہ راست پر لاسکتی ہے...... عفت آرا مرزا مسعود کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ راہ راست پر لے آتی ہے...... عفت آرا نذیر احمد کے کرداروں کی طرح اسم بامسمیٰ ہے۔ شرر کے معاشرتی ناولوں کا پلاٹ سب سے زیادہ مربوط اور گٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک اچھے کھلاڑی کی طرح ترپ کا پتہ آخر تک اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں یعنی صرف ناول کے آخری صفحات میں عفت آرا کی غیب دانی کا علم ہوتا ہے۔''

(ڈاکٹر شریف احمد، عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن، سن اشاعت:1989، گوہر پبلیکیشنز دہلی، ص107)

ناول 'حسن کا ڈاکو' ان کے معاشرتی ناولوں میں اس وجہ سے اہم ہے کہ اس ناول میں انھوں نے عورت کا نہایت ہی فعال اور بہادر کردار پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار ''مہ لقا'' فارسی اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرچکی ہے۔ علاقہ حلال پور میں جب اچانک لڑکیوں کے غائب ہونے کی سنسنی خیز خبر پھیلتی ہے تو ''مہ لقا'' اپنے منگیتر سے کہتی ہے کہ شادی کے بعد ڈولی سے دلہن کا غائب ہوجانا علاقے میں دہشت پھیلاتا جارہا ہے اور لڑکیوں کے غائب ہونے کا سراغ لگانے کے لیے میں چاہتی ہوں کہ ہم اپنی شادی کو ٹالنے کے بجائے جلد انجام دیں، تاکہ میرے غائب ہونے پر میں یہ جان سکوں کہ آخر میری ہم وطن بہنیں کہاں غائب ہوکر چلی جاتی ہیں۔ اگر میں کامیاب ہوئی اور واپس آئی تو

ساری عمر تمھاری ہو کر رہوں گی، نہیں آئی تو سمجھنا کہ تم پر قربان ہو گئی۔ منیر مہ لقا کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ یہ سارے علاقے کی لڑکیوں کو بچانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہے تو میں کیوں کر نہ اس کا ساتھ دوں۔ اس طرح مہ لقا نہایت ہی جرأت مندانہ قدم اٹھاتی ہے۔ شرر نے انیسویں صدی میں مہ لقا کے روپ میں اردو ناول کو ایک ایسا نسائی کردار دیا ہے، جو ہر اعتبار سے ایک مکمل تانیثی کردار معلوم ہوتا ہے۔ اس میں جو دانشمندی اور بہادری دکھائی دیتی ہے، ناول کے مرد کرداروں میں بھی اس طرح کی بہادری نہیں ملتی۔ اگر ہم یہ کہے تو بے جا نہ ہوگا کہ شرر کی مہ لقا اردو کا ایک ایسا باشعور تانیثی کردار ہے جو اس دور کے ناولوں کے نسائی کرداروں پر ہر لحاظ سے بھاری پڑتا ہے۔

'حسن کا ڈاکو' میں ایک اور نسائی کردار سکینہ کا ہے جو بلند حوصلے رکھتی ہے۔ مردانہ بھیس میں منیر کے ہمراہ غائب ہوئی لڑکیوں کو ڈھونڈ نے نکل پڑتی ہے اور کامیابی ہاتھ آنے تک بہت ہی دلیرانہ انداز میں لڑتی رہتی ہے اور آخر کار اغوا شدہ لڑکیوں کا سراغ لگانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ تاہم اس کردار سے بھی زیادہ ہوشیار، عقلمند اور بلند حوصلہ مہ لقا رکھتی ہے۔ وہ تن تنہا ہی حلال پور کی لڑکیوں کے غائب ہونے پر ایک دلیرانہ قدم اٹھاتی ہے۔ اس کی ہمت اور استقلال کو شرر ہندوستانی معاشرہ کی دین قرار دینے کے بجائے جدید تعلیم کو اس کے حوصلے کا سبب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود مہ لقا کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ایک انگریزی کی تعلیم نے ہندوستان کی عام عورتوں کے خلاف اس میں (مہ لقا) ایسا عجیب حوصلہ پیدا کر دیتا تھا کہ جب حلال نگر میں بازار حسن پر ڈاکہ پڑنے کا حال سنا اور دیکھا کہ مجرم کسی طرح گرفتار نہیں ہوتے تو آمادہ ہو گئی کہ اپنی بہنوں کی ہمدردی کے لیے خود اپنے آپ کو آفت میں پھنسا دے۔''

(عبدالحلیم شرر، حسن کا ڈاکو، حصہ دوم، سن اشاعت: 1919، دلگداز پریس لکھنؤ، ص 14)

مہ لقا کے کردار میں شرر نے واقعی ایک غیر معمولی قوت بھر دی ہے جو اس عہد میں غالباً ہندوستان کی کوئی خاتون سوچ بھی نہیں سکتی تھی، مہ لقا کر کے دکھاتی ہے وہ خود کو خطرے میں ڈالتی ہے لیکن نہایت عقلمندی سے اپنی عصمت کی حفاظت بھی کرتی ہے اور اغوا ہوئی لڑکیوں کو جس نواب نے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے ارادے سے اغوا کرایا تھا، بچا لاتی ہے۔ نواب کے اس اخلاق سوز فعل میں شامل عمر رسیدہ وزیرن، سعد اللہ اور طوائف شہزادی سبھی کو عبرت ناک سزائیں دلواتی ہیں۔ اس کردار کی ہمت، حوصلہ اور دانشمندی کو دیکھتے ہوئے فہمیدہ کبیر لکھتی ہیں:

> ''مہ لقا بیگم کے روپ میں انہوں نے قوم کے سامنے ایسی ہی عورت کا تصور پیش کیا ہے۔ جاں بازی، اولالعزمی اور قومی ہمدردی کی صفات اس کے کردار میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ مردوں کی ہوس سے اپنی ہم جنسوں کو بچانے کے لیے اس نے جو خطرات مول لیے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''

(فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور نذیر احمد سے پریم چند تک، سن اشاعت 1992، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ص 71)

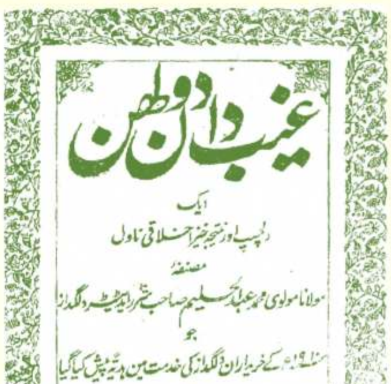
غیب دان دلھن
ایک
دلچسپ اور نتیجہ خیز اخلاقی ناول
مصنفہ
مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر ایڈیٹر دلگداز
جو
سنہ ۱۹۱۱ء کے خریداران دلگداز کی خدمت مین ہدیۃً پیش کیا گیا
اور
باہتمام محمد فاروق منیجر دلگداز
سنہ ۱۹۱۱ء مین
دلگداز پریس لکھنؤ واقع کٹرہ بزن بیگ خان مین
چھپ کے شائع ہوا

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرر کا یہ کردار اپنے عہد کی بے جا پابندیوں کے خلاف بغاوت کا درجہ رکھتا ہے جو نہ صرف خود بہادر ہے بلکہ کم ہمت اور پست حوصلہ رکھنے والی عورتوں کے اندر بھی جرأت مندی کا مادہ ڈالتا ہے۔ مہ لقا شرر کے اب تک کے نسوانی کرداروں میں ایک لازوال کردار ہے جو اتنی لیاقت رکھتی ہے کہ نہ صرف عیاش اور ہوس پرست مردوں سے خود کو بچائے رکھتی ہے بلکہ باقی عورتوں کو بھی ان کے چنگل سے آزاد کراتی ہے۔

اسی طرح 'خوف ناک محبت' میں انھوں نے ضعیف الاعتقاد اور لاعلم عورتوں کا نقشہ 'زینب' کے کردار کے ذریعہ کھینچا ہے۔ جو اپنے عالم و فاضل اور باعزت شوہر پر ایک ڈھونگی 'بلاقی شاہ' کے اکسانے پر شک کر کے اپنی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہے۔ اس ناول میں ایک باعزت شہری سے حسد

کرکے اس کے حاسد ہدو، لچھو اور بلاقی شاہ اس کی ان پڑھ اور بھولی بھالی بیوی کا سہارا لیتے ہیں جو بہت ہی قلیل مدت میں ان مردوں کے دوام فریب میں گرفتار ہوجاتی ہے اور اپنے گھر کا چین سکون اپنے ہی ہاتھوں تباہ کردیتی ہے۔ زینب کے شوہر اس قدر شریف النفس ہیں کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد بھی اس سے غصہ نہیں ہوتے۔ البتہ ناراضگی کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ زینب کی عقل پر بلاقی شاہ کا پردہ ایسا پڑا تھا کہ شوہر ہی تنگ آکر اپنی ساری جائداد اور دولت چھوڑ کے بھاگ جانے پر مجبور ہوجاتا ہے اور اس کے جاتے ہی بڑی چالاکی سے زینب سے یہ ساری دولت چھین لی جاتی ہے۔ اس طرح وہ شوہر اور جائداد دونوں کو کھو بیٹھتی ہے۔ اس ناول پر علی احمد فاطمی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ”شرر کا یہ ناول اس عہد کے معاشرت کی ان عورتوں سے تعلق رکھتا ہے، جو شوہر پرستی کی اس دھند میں ڈوبی رہتی تھیں جہاں عمل کی روشنی دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی پرستش میں شوہر کے حق میں غلط قدم اٹھا جاتی تھیں اور نقصان اٹھاتی تھیں، لیکن پھر بھی اپنے ان اعمال کو نیک خیال کرتی تھیں۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایسی عورتوں کو ہر عہد میں بہکانے والے مل جاتے ہیں۔ اس ناول میں بھی چند ایسے کردار ہیں جو زینب جیسی شوہر پرست بیوی کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور بھڑکاتے ہیں۔“

(علی احمد فاطمی، عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار، سن اشاعت: 2007، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ص 331/332)

مندرجہ بالا اقتباس میں علی احمد فاطمی کا کہنا بجا طور پر درست ہے کہ عورت کو بہکانے والے ہر دور میں مل جاتے ہیں لیکن ہر دور میں اگر عورت کی صحیح تعلیم وتربیت کی جائے، اسے اس قابل بننے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ لیتے وقت سوچنے سمجھنے پر مجبور ہوجائے تو یقیناً ان کا انجام زینب جیسا ہرگز نہ ہوگا۔ مگر افسوس کہ عورت کی تعلیم وتربیت کے بجائے اس دور میں عورت کی عفت وعصمت کی نگہداشت گھر کی چہاردیواری میں قید رکھ کر کی جاتی رہی ہے۔

شرر کے دور میں غیر منقسم ہندوستان میں زینب جیسی ہزاروں خواتین موجود تھیں جو نہ صرف اپنی بلکہ پورے گھریلو نظام کی تباہی کا باعث بن بیٹھی تھیں۔ ان خواتین کی لاعلمی کا تذکرہ شرر اس ناول میں غالباً اسی وجہ سے کرتے ہیں کہ معاشرہ عبرت حاصل کرے اور مردوں کے دوش بہ دوش عورتوں کو بھی نئی فضا سے ہم کنار ہوکر کامیاب اور خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں نذیر احمد اور سرشار نے کئی ناول تحریر کیے کہ انھیں عورتوں کی زبوں حالی کا نہایت افسوس تھا البتہ شرر نے ان سے الگ سوچ رکھنے کے سبب ناول 'طاہرہ' میں ہندوستانی عورت کو انگریزی طرز رہائش اختیار کرتے ہوئے پیش کیا۔ یہ عورت ناول کی مرکزی کردار ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد ایک انگریز خاتون اس کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جائداد کا ایک حصہ بھی طاہرہ کے نام کردیتی ہے۔ طاہرہ ان انگریزوں ہی کی طرح بولتی چالتی ہے، پورا رہن سہن انگریزوں جیسا اختیار کرتی ہے لیکن اس میں ہندوستانی عورت کی طرح شرم وحیا، وفا شعاری اور پاکدامنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب میں شامل بھی مہذب چیزیں اس کے کردار میں موجود ہیں لیکن وہ کہیں بھی بے راہ روی اور بے حیائی کا کوئی کام کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر اس دور میں بہ مشکل مردوں کا انگریزی تعلیم حاصل کرنا مسلم معاشرہ میں رائج ہوا جا رہا تھا۔ عورتوں کا انگریزی تعلیم اور رہن سہن اختیار کرنا گویا کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بچپن میں ”ولی اللہ“ نامی شخص سے جوڑی گئی اس کی نسبت سن بلوغ کو پہنچتے ہی ولی اللہ توڑ دیتا ہے کیونکہ طاہرہ انگریزی بولتی تھی اور انگریزوں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ ولی اللہ ان مردوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے نزدیک انگریزی تعلیم ایک غیر اسلامی فعل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی ذہن سازی کرنے کے لیے غالباً یہ ناول تحریر کیا گیا ہے چنانچہ شرر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”کسی کی زبان بولنے سے کوئی کسی کے دین میں نہیں جاتا۔
> عرب اور شام اور روم و ایران میں مسلمان عیسائیوں سے میل

جول رکھتے اور ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو عیسائیوں سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ جو کوئی ان سے ملے جلے ان کی بولی بولے، ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے، کھائے پیے اسے بھی کرانی کہنے لگتے ہیں۔"

(عبدالحلیم شرر، طاہرہ ،سن اشاعت:1923۔شاہی پریس لکھنؤ،ص13)

شرر اس اقتباس میں ان عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھاتے ہیں جو انگریزی زبان سے واقف ہیں اور جنھیں جدید تعلیم حاصل کرنے کے سبب زوجیت میں لینے سے مسلمان مرد بالخصوص قدیم روایات سے پاسدار کتراتے ہیں۔ طاہرہ کی عقلمندی، دین داری، سلیقہ شعاری اور پاک دامنی کو مدنظر رکھتے ہوئے شرر کہتے ہیں کہ ایسی عورت ہندوستان میں چراغ لے کر ڈھونڈنے کے بعد بھی نہیں ملے گی۔

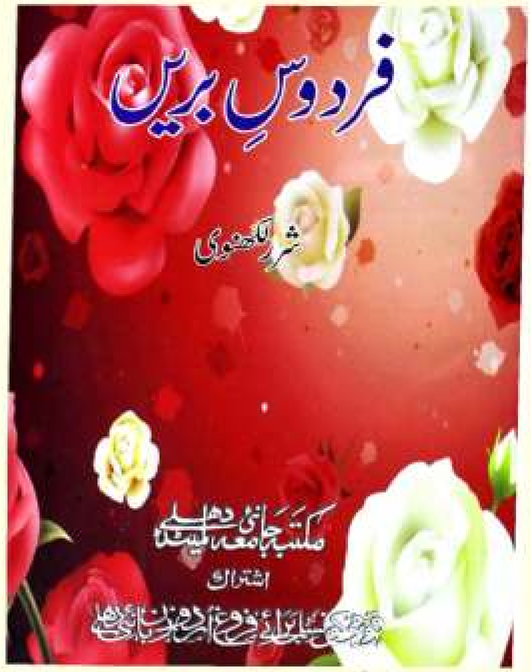

شرر کے تاریخی ناولوں میں 'فردوس بریں' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے جس میں فرقۂ باطنیہ کو موضوع بنا کر تحریر کیا تھا۔ یہ فرقہ پانچویں صدی میں وجود میں آیا تھا اور اس کے وجود میں آنے کا مقصد دنیائے اسلام میں نوجوانوں کو ورغلا کر، ان سے مذہب اسلام کی اہم اور بڑی شخصیات کا سر قلم کروانا تھا۔ مذکورہ ناول میں دو نسوانی کردار ہیروئن 'زمرد' اور 'ملکہ بلغان خاتون' کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زمرد اگرچہ ناول کی ہیروئن ہے لیکن اس کردار میں کہیں ہمت اور بہادری جیسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ ضدی ہے مگر ڈرپوک بھی۔ بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جانا چاہتی ہے لیکن راستے میں حائل ہونے والی دشواریوں کا اسے خوف بھی ہے پھر بھی فاتحہ پڑھنے کی ضد پوری کرنا چاہتی ہے۔ وہ جب فرضی پریوں کے ذریعے جنت ارضی لے جائی جاتی ہے اور وہاں اس حقیقت سے واقف ہوتی ہے کہ یہ کوئی جنت نہیں بلکہ بھولے بھالے لوگوں کو فریب دے کر ان سے وہ سب کروایا جاتا ہے، جو فرقہ باطنیہ کے لوگوں کا منشا ہوتا ہے اور یہیں پر جب اپنی عصمت کو خطرے میں محسوس کرتی ہے تو عقلمندی سے کام لے کر اپنی عصمت بچائے رکھنے میں بھی کامیاب ہوتی ہے۔ البتہ فرقہ باطنیہ اس کا استعمال کر کے حسین سے جو انسانیت سوز کام کرواتے ہیں۔ اس وقت زمرد کٹھ پتلی کی طرح ناول میں نظر آتی ہے۔ حسین سے جنت ارضی پر ملاقی ہوتے وقت وہ حسین کو حقیقت سے آگاہ کرانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ ڈر اور خوف کے سبب چپی سادھ لیتی ہے اور جب بادشاہ کے دربار سے نکالنے پر اور زمرد سے دوبارہ نہ ملنے کے دکھ سے بے حال اور پریشان حسین کو دیکھتی ہے تو اس کردار میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے وہ جنت ارضی کی ساری حقیقت حسین تک ایک خط کے ذریعے پہنچا دیتی ہے۔ زمرد کا کردار ایک عام اور روایتی رحم دل اور کمزور قلب عورت کا ہے۔ فردوس بریں پر حملہ ہوتے وقت وہاں قتل غارت دیکھ کر آنسو بہاتی ہے۔ سمجھانے بجھانے پر وہ یہی کہتی ہے کہ یہ لوگ واجب القتل ہی سہی لیکن یہ قتل وغارت اس کے دل کو دکھی کر دیتا ہے۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید میں علی عباس حسینی اس کردار پر بات کرتے ہوئے غالباً اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عورت کا دوسرا نام کمزوری ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اس ناول کا پلاٹ زمرد کے کردار پر مبنی ہے۔ حسین کے لیے وہ بے انتہا جذب کا مرکز ہے لیکن ہمیں صرف اس وقت کشش محسوس ہوتی ہے، جب فردوس میں قتل غارت کے ہنگامے میں وہ اپنی نسوانی فطرت کا مظاہرہ کرتی ہے اور رونے لگتی ہے.....سچ ہے عورت تیرا دوسرا نام کمزوری ہے!"

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید ،ایڈیشن:2005 ،ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی،ص243)

زمرد کے برخلاف ملکہ بلغان خاتون کا کردار نہایت ہمت، استقلال اور بہادری کی دلیل پیش کرتا ہے۔ اپنے بھائی 'ہلاکو خان' سے جب وہ فردوس بریں پر حملہ کرنے کا مشورہ کرتی ہے تو ہلاکو خان اس کے عورت ہونے کی بنا پر اسے جنگ میں ساتھ لینے سے گریز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس جنگ میں عورت کا کیا کام؟ ملکہ بلغان اپنے جوابات سے نہ صرف اسے چپ کراتی ہے بلکہ فرقہ باطنیہ کو ختم کرنے کے لیے روانہ بھی

ہوتی ہے اور ایسی جنگ لڑتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔تب ہی علی عباس حسینی کا زمرد کے کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے عورت کو کمزور کہنے سے ذہن بالکل بھی اتفاق نہیں کرپاتا۔ چنانچہ بالغان خاتون کے کردار پر بات کرتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

''بلغان خاتون کے کردار میں سمندر سے زیادہ چمک ہے۔وہ تاتاری، باعمل مردانی قسم کی عورت ہے۔ انتقام لینے کے جذبے کے تحت وہ باپ کا سوگ تک بھول جاتی ہے......وہ صرف پانچ سو سوار لے کر قلعہ المتو تیہ کو فتح کرنے نکل کھڑی ہوتی ہے اور محض ایک سپاہی ساتھ لے کر جنت الفردوس میں گھس جاتی ہے وہ دلیر ہی نہیں بلکہ سفاک بھی ہے۔وہ کشت وخون، ظلم وغارت گری کی عادی ہے۔ وہ اپنے بھائی ہلاکو خان کے ساتھ باطنیوں کا قتل عام دیکھتی ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا......اچھا ہی ہوا کہ تہذیب وتعلیم نے اس طرح کے کردار ایک حد تک کم کردیے۔''

(علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید ، ایڈیشن:2005، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی، ص243)

مندرجہ بالا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ہے کیونکہ یہاں عورت کی بہادری اس کی خود کی بہادری سے نہیں بلکہ مردانہ تقسیم کی بہادری سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اس کی دلیری مردانہ قسم کی بتائی جارہی ہے۔ گویا بہادری، جرأت مندی جس قسم کی بھی ہو وہ مردوں سے منسوب ہے۔عورت کے حوالے سے اسی کتاب میں وہ متضاد رائے دیتے ہیں۔زمرد کو دیکھ کر عورت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ عورت تیرا دوسرا نام کمزوری ہے اور بلغان خاتون کی بہادری غالباً ناگوار گزرتی ہے۔لہٰذا مسرت اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ اچھا ہوا ایسے کردار تعلیم نے کم کردیے۔علی عباس حسینی عورت کا معاشرہ میں کون سا کردار دیکھنا پسند کرتے تھے یہاں اس پر بحث نہیں بلکہ راقم الحروف کی غرض مدعا یہ ہے کہ جس طرح سماج میں مردوں کے مختلف کردار دیکھنے کو ملتے ہیں، کہیں کمزور، کہیں بہادر، کہیں شریف النفس تو کہیں بدکار اسی مناسبت سے سماج میں عورت کے روپ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک ناول فردوس بریں کا تعلق ہے یہاں ایک معتبر نقاد کا عورت کے دو روپ دیکھ کر ایک ہی وقت پر متضاد رائے دینا غالباً زیادتی ہے۔

الغرض یہ دونوں کردار اردو کے ابتدائی نسوانی کرداروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔زمرد جہاں نسوانی فطرت کے سبب کمزور پڑتی ہے وہی جنت ارضی میں دشمنوں کے بیچ رہ کر وہ عقل اور دانشمندی سے اپنی عصمت بچاتی ہے اور ہمت ہارے بنا آخر تک ان کی چالوں پر نظر رکھتی ہے۔ بلغان خاتون اپنے والد کی موت کا انتقام لینے کا جذبہ ویسے ہی رکھتی ہے جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کے قتل کے بعد رکھتا ہوگا۔وہ بہادر اور جرأت مند ہے۔عورت ضعیف الجنس ہے اس بات کو وہ اپنی جرأت مندی سے غلط ثابت کرتی ہے۔ چوں کہ ناول حقیقی زندگی کا ترجمان مانا جاتا ہے۔لہٰذا شرر نے زیر بحث ناول میں اسی حقیقی زندگی سے وابستہ دو متضاد نسوانی کردار پیش کیے ہیں۔جن میں ایک جذبہ رحم سے عاری اور دوسرا بے باک اور باحوصلہ ہے۔سماج میں ہمیں متذکرہ کرداروں کی حقیقی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تاہم ہم پوری طرح کمزور خواتین کو مکمل طور پر بلغان خاتون جیسی ہمت اور حوصلہ نہیں بخش سکتے ہیں دوسری طرف عورت کی جہالت' توہم پرستی' ضد اور ضعیف الاعتقادی کی شرر نے کئی مثالیں محض اس وجہ سے پیش کی ہیں تاکہ عورت بذات خود اپنی اصلاح کی سعی کرے اور ایسے کرداروں سے عبرت حاصل کرے جو اپنی کم عقلی اور لاعلمی کے سبب گھر اور سماج دونوں کی بربادی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نسواں کی بات کی جائے تو شرر اپنے ناولوں میں اردو کے اولین ناول نگار نذیر احمد سے کہیں زیادہ جدت پسند معلوم ہوتے ہیں۔ وہ عورت کی سماج میں بہتر حالت کی غرض سے پردے کی سخت گیری کی مخالفت، مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی حمایت کی آواز بلند کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔عورتوں کی اصلاح اور ان کی فلاح و بہبودی کے لیے وہ نذیر احمد اور سرشار کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اپنی منفرد سوچ لے کر آتے ہیں اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی نئی فضا اور نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کرانے پر زور دیتے ہیں۔ان کے نزدیک خواتین میں شعور پیدا کرنے کی غرض سے انھیں سخت پردے کی قید سے آزادی دلانے کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے آراستہ کرانا ضروری ہے اور ان کا یہی نظریہ انھیں اردو کے ابتدائی ناول نگاروں سے منفرد بنادیتا ہے۔

□□□

Ruqaya Nabi
Ph.D Research Scholar
Girls Hostel, Room NO.05
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad-500032 (Telangana)

کلثوم فاطمہ نصیر

عہدِ ماضی میں خواتین کے کارنامے

عہد ماضی سے عہد حال تک خواتین کے کارنامے سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ملک میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں خواتین نے قابل فخر کارنامے انجام نہ دیے ہوں۔ بات سیاست کی ہو یا حکمرانی کی، یا پھر مصوری، موسیقی اور شعروادب ہی کیوں نہ ہو ہر میدان میں خواتین کے کارنامے تاریخ کے صفحات پہ درج ہیں۔ تاریخ ماضی کے اوراق پلٹنے پر بے شمار خواتین کے بے شمار واقعات نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں جن خواتین کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے ان میں چاند بی بی کا نام بے حد اہم ہے۔ بیجاپور سلطنت کی ملکہ چاند بی بی مغل بادشاہ اکبر کی ہم عصر تھیں۔ لیکن انھوں نے اکبر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا اور دکن کی تمام دیسی ریاستوں کو متحد ہو کر اکبر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ چاند بی بی محل کے اندر بیٹھ کر حکومت نہیں چلاتی تھیں بلکہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی ریاست کی عوام کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ چاند بی بی کو مراٹھی اور کنڑ زبانوں پر عبور تھا اور عربی، فارسی و ترکی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ انھیں مصوری اور ہندوستانی موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ خود ستار بجاتی اور پینٹنگس بھی بناتی تھیں۔

چاند بی بی کی طرح رانی درگاوتی بھی اپنی بہادری اور علم دوستی کے لیے شہرت رکھتی ہیں۔ گونڈوانہ ریاست کی رانی درگاوتی نے بھی مغل بادشاہ اکبر کی شرائط ماننے سے انکار کیا۔ وہ بھی چاند بی بی کی طرح جنگ کے میدان میں گھوڑے پہ سوار ہو کر اپنی فوج کی قیادت کرتی تھیں۔ رانی درگاوتی کو سنگ تراشی سے بڑی دلچسپی تھی۔ عالمی شہرت رکھنے والے کھجوراہو کے مندروں میں جو گل بوٹے نظر آتے ہیں ان میں رانی درگاوتی کا اہم رول ہے۔

ہمارے ملک میں جب بھی سماجی اصلاح اور لڑکیوں کی تعلیم کی بات ہوگی تو ملک ساوتری بائی پھولے کو عقیدت سے یاد کرے گا۔ ساوتری بائی پھولے نے اپنے شوہر جیوتی راؤ پھولے کے ساتھ مل کر مہاراشٹر میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ساوتری بائی پھولے وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے 1848 میں پہلی بار لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا۔ وہ خواتین میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے دن رات محنت کرتی رہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی چھوا چھوت اور اونچ نیچ کی بیماری کو ختم کرنے کے لیے ساوتری بائی پھولے نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ خواتین کے حقوق کے لیے لڑنے والی وہ ایک نڈر بے باک سماجی کارکن تھیں۔ وہ اپنے زمانے کی ایک مقبول شاعرہ بھی تھیں۔ ان کی شاعری میں دبے کچلے عوام کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اب ایک نظر ایسی خواتین پر جنھیں ہندوستان میں اپنے اپنے میدان میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ بے سہاروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے والی مدر ٹیریسا پہلی خاتون تھیں جنھیں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ محترمہ اندرا گاندھی ہندوستان میں پہلی خاتون وزیراعظم تھیں تو محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل پہلی خاتون صدر جمہوریہ ہند۔ محترمہ کرن بیدی ہندوستان کی پہلی خاتون آئی پی ایس بنیں تو محترمہ انا ملہوترہ نے پہلی خاتون آئی اے ایس بن کر سرفہرست رہنے والی خواتین میں اپنا نام درج کرایا۔ محترمہ بچھیندری پال پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھوں نے 1984 میں ماؤنٹ ایوریسٹ فتح کیا۔ ہندوستانی لان ٹینس کی تاریخ میں ثانیہ مرزا وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے 2005 میں ڈبلو ٹی اے ٹائٹل جیت کر ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ 2015 میں ثانیہ مرزا نے ایک بار پھر ایک ریکارڈ قائم کیا جب وہ ڈبلو ٹی اے کی ڈبل رینکنگ میں پہلے مقام پہ

پہنچی۔ سائنہ نہوال وہ پہلی ہندوستانی خاتون بیڈمنٹن کھلاڑی ہیں جنھوں نے اولمپک میں میڈل حاصل کر کے ملک کا وقار بڑھایا۔ باکسنگ کے میدان میں میری کوم وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ورلڈ چمپئن شپ میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ہندوستان میں جب بھی اتھلیٹکس کا نام زبان پہ آئے گا تو پی ٹی اوشا، اشونی ناچپا اور انجو بابی جارج کا نام خود بہ خود سامنے آتا رہے گا۔

زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں شعر و ادب، موسیقی، مصوری اور گلوکاری میں خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ میں رضیہ سلطان اور نور جہاں دو ایسی طاقتور خاتون ہیں جنھیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ رضیہ سلطان وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے دہلی سلطنت پہ حکمرانی کی اور شان سے حکمرانی کی۔ دوسری طرف جہانگیر کی ملکہ نور جہاں نے نہ صرف اپنی دخل اندازی سے حکمرانی کے طور طریقوں میں سدھار کیا بلکہ عطر گلاب جیسی کئی اہم ایجادات بھی کیں۔ آگرہ میں اپنے والد اعتماد الدولہ کا مقبرہ بنوا کر تاج محل کے لیے راہ ہموار کی۔ یہ مقبرہ عہد مغل میں سفید سنگ مرمر سے بنی پہلی عمارت ہے۔ حکمرانی کے حوالے سے اگر رضیہ سلطان اور نور جہاں کا نام ابھرتا ہے تو شعر و ادب کی دنیا میں گلبدن بیگم اور میرابائی جیسی خواتین بھی رہی ہیں، جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا لیکن انھوں نے قلم و کتاب سے اپنا رشتہ مضبوط کیا۔ گلبدن بیگم نے اس زمانے میں ''ہمایوں نامہ'' لکھ کر اپنی پہچان قائم کی جب خواتین کے لیے محض حرف شناسی کو کارِ نمایاں تصور کیا جاتا تھا۔ ہندی میں کرشن بھکتی کی شاعری کے حوالے سے جو دو سب سے اہم نام سامنے آتے ہیں وہ سُور داس اور میرابائی کے ہیں۔ میرابائی میڑتیا کے راٹھور رتن سنگھ کی بیٹی، راؤ داؤ جی کی پوتی اور جودھپور کے بسانے والے مشہور راؤ جودھا جی کی پرپوتی تھیں۔ اُدے پور کے مہارانا سانگا کے بیٹے مہارانا کمار بھوج راج سے میرا کی شادی ہوئی تھی۔ لیکن کمار بھوج راج کے انتقال کے بعد میرا نے اپنے آپ کو پوری طرح کرشن بھکتی کے حوالے کر دیا۔ میرابائی نے تو اپنا راج گھرانہ بھی چھوڑ دیا اور کرشن بھکتی میں ڈوب کر متھرا براندابن میں گیت گاتی رہیں۔ بعد کے زمانے میں حجاب امتیاز علی، نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، سروجنی نائڈو، مہادیوی ورما، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی جیسی خواتین قلم کاروں نے ہندوستانی شعر و ادب کو بیش قیمتی سرمایہ عطا کیا۔

گلوکاری کے میدان میں بیگم اختر، منی بائی، زہرا بائی امبالے والی، گیتا دت، امیر بائی کرناٹکی، مبارک بیگم، گرجا دیوی، شمشاد بیگم، گنگو بائی ہنگل، ثریا، جانکی ایس، آشا بھوسلے اور لتا منگیشکر جیسی خواتین پہ کس ہندوستانی کو ناز نہیں ہے یہ فہرست کافی طویل ہے۔ مقصد فہرست سازی نہیں بلکہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہندوستانی گلوکاری کو خواتین نے کیسی دولت عطا کی ہے۔ کرناٹک گھرانے کی موسیقی کو عالمی پہچان دلانے والی ایم ایس سُبالکشمی وہ پہلی خاتون گلوکارہ ہیں جنھیں بھارت رتن سے نوازا گیا۔ بیگم اختر اگر اپنی ٹھمری، خیال اور غزل گائکی کے لیے شہرت رکھتی ہیں تو شمشاد بیگم اپنی آواز کی کھنک سے پہچانی جاتی ہیں۔ شمشاد بیگم کی گائکی کو آل انڈیا ریڈیو نے پہچان عطا کی۔ بعد میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کو شمشاد بیگم نے لاتعداد سُپر ہٹ نغمے دیے۔ شمشاد بیگم کا شمار ہندوستانی سنیما کی ان خوش نصیب فنکاروں میں ہوتا ہے جنھیں عوام کے ساتھ خواص نے بھی بے حد پسند کیا۔ وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے پہلے دور کی پلے بیک سنگر ہیں۔ انھوں نے اردو، ہندی کے علاوہ بنگالی، پنجابی، تمل، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں 6 ہزار سے زیادہ گانے گائے ہیں۔ انھوں نے ایس ڈی برمن اور نوشاد علی جیسے مایا ناز موسیقاروں کی دھنوں کو اپنی کھنکتی آواز سے سجایا۔ گرجا دیوی نے کلاسیکی انداز گائکی کو عام کیا تو لتا منگیشکر نے آواز میں شہد گھول کر گلوکاری کو بلندی عطا کی ہے۔ میدان موسیقی میں ایم ایس سُبالکشمی کے نام کے بغیر کوئی بات نہیں کی جا سکتی ہے۔ ششی کلا دانی اور ونجا موری سیتا دیوی جیسی کلاسیکل موسیقاروں نے ہندوستانی موسیقی کو دنیا میں پہچان دلانے میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ششی کلا دانی آل انڈیا ریڈیو کی اے گریڈ آرٹسٹ رہی ہیں۔ انھوں نے جل ترنگ کو عالمی سطح پر مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جبکہ ونجا موری سیتا دیوی نے تیلگو لوک گیتوں کو ایک نئے انداز میں پیش کر کے لاکھوں دلوں پر حکومت کی ہے۔

ہندوستانی مصوری کا کوئی ذکر امرتا شیر گل کے بغیر نامکمل ہے۔ بھارت کی امرتا شیر گل مصوری کی دنیا میں سب سے مشہور ہندوستانی خاتون ہیں۔ اپنے زمانے میں سنسکرت اور فارسی کے مشہور عالم سردار امراؤ سنگھ شیر گل مجیٹھیا کی بیٹی امرتا شیر گل اگرچہ بڈاپسٹ ہنگری میں پیدا ہوئیں لیکن مشرقی یوپی کے گورکھپور کے پاس سرّیا سردار نگر میں انھوں نے زندگی کے کئی اہم سال گزارے۔ یہاں رہتے ہوئے وہ گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی مصوری سے متاثر ہوئیں اور اپنی پینٹنگس میں گاؤں، دیہات اور ہندوستانی عورتوں کو پیش کر کے دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا۔ ان کی مصوری میں وطن سے ان کی محبت کی جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے سماج کے دبے کچلے لوگوں کو بھی اپنی مصوری کا موضوع بنایا۔ ہندوستان کے گاؤں اور ہرے بھرے کھیتوں کو انھوں نے اپنی مصوری میں جگہ دی۔ 1948 میں بڑودہ میں پیدا ہوئیں نیلیما شیخ نے عورتوں کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنی مصوری کا موضوع بنایا۔ نیلیما شیخ نے فائن آرٹس کی تعلیم و تربیت کو عام

کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی پینٹر ہیں بلکہ پینٹنگ کی تعلیم کو قابل فہم اور قابل تقلید بنانے میں ان کی کوششیں شامل رہی ہیں۔ ان کی مصوری نے رفتہ رفتہ عالمی سطح پر اپنی پہچان بنائی۔ انجولی ایلا مینن، ارپنا سنگھ، نیلیما شیخ اور ریما بنسل جیسی خواتین نے انٹرنیشنل آرٹ گیلری میں اپنی موجودگی سے ہندوستان کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔

> **"نیلیما شیخ نے فائن آرٹس کی تعلیم و تربیت کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا. وہ نہ صرف ایک اچھی پینٹر ہیں بلکہ پینٹنگ کی تعلیم کو قابل فہم اور قابل تقلید بنانے میں ان کی کوششیں شامل رہی ہیں. ان کی مصوری نے رفتہ رفتہ عالمی سطح پر اپنی پہچان بنائی"**

جنگ آزادی کی طویل تاریخ خواتین کے کارناموں سے لبریز ہے۔ بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی، بیگم زینت محل، جھلکاری بائی، بی اماں، سوچیتا کرپلانی، وجے پنڈت، اینی بیسنٹ، کستوربا اور سروجنی نائڈو سے لے کر ارونا آصف علی تک ایک طویل فہرست ہے۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں بیگم حضرت محل نے اپنے شوہر نواب واجد علی شاہ کی غیر موجودگی میں خود محاذ آرائی کی۔ جنگ آزادی کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مل کر بیگم حضرت محل نے بڑی شجاعت اور بہادری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ لگاتار نانا صاحب، ویر کنور اور تاتیا ٹوپے کے رابطے میں تھیں۔ انھوں نے انگریز افسر سر ہینری لارنس کو شکست دے کر لکھنؤ پہ قبضہ برقرار رکھا تھا۔ بعد میں جب جنرل ہیولاک اور کیمپ ویل نے مل کر لکھنؤ کا محاصرہ کر لیا تو بھی بیگم حضرت محل نے انگریزوں کی غلامی قبول کرنے کے بجائے در بہ در بھٹکنا منظور کیا۔ بی اماں کے نام سے مشہور محترمہ عبادی بیگم جنگ آزادی کے دو عظیم رہنماؤں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کی ماں تھیں۔ بی اماں نے خواتین کو متحد کرنے اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔ ایک بار جب مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا تو یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ مولانا محمد علی جوہر انگریزی حکومت سے معافی مانگ کر آزاد ہو جائیں گے۔ ایسے موقعے پر ان کی والدہ بی اماں نے کہا کہ اگر ان کا بیٹا انگریزی حکومت سے معافی کا طلبگار رہتا ہے تو ایسے بیٹے پر لعنت بھیجتی ہیں اور اس کا دودھ معاف نہیں کریں گی۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ میرا بیٹا وطن پہ قربان ہونے کے لیے ہے۔ معافی مانگنے کے لیے نہیں۔ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی اور بیگم زینت محل کے نام سے کسی حد تک واقف بھی ہیں لیکن عزیزن، رضیہ خاتون اور زبیدہ داؤدی جیسی خواتین کے نام تک سے واقفیت نہیں ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑی دلیری سے حصہ لیا۔ زبیدہ داؤدی اپنے شوہر مولانا شفیع داؤدی کے ساتھ مل کر سودیشی تحریک چلاتیں اور خواتین کو اس بات کے لیے آمادہ کرتیں کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں شامل ہوں۔ بڑی تعداد میں ہندوستانی طالب علم بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے اور گاندھی جی کے نظریات سے متاثر ہو کر سرکاری اسکولوں کا بائکاٹ کرتے اور پڑھائی چھوڑ دیتے تھے۔ ایسے طالب علموں کے لیے مولانا شفیع داؤدی اور ان کی بیگم زبیدہ داؤدی نے اسکول کھولا، انھیں مفت تعلیم دی اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ عزیزن جیسی معمولی عورت نے لکھنؤ میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ نانا صاحب نے جب اودھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شامل ہونے کی آواز دی تو عزیزن نے ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ وہ انگریزی فوج کی جانکاریاں خفیہ طریقے سے حاصل کرتی اور اسے ہندوستانی سپاہیوں تک پہنچاتی تھی۔ انگریزوں نے جب عزیزن کو گرفتار کیا تو اس نے وطن پہ مر جانا قبول کیا لیکن اپنے ساتھیوں کو پتہ ٹھکانہ بتانے سے انکار کر دیا۔ ان کے علاوہ سعادت بانو کچلو، زلیخا بیگم اور امجدی بیگم جیسی خواتین نے بھی جنگ آزادی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ہندوستانی خواتین کی خدمات کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ جبکہ سائنس، میڈیکل سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی ہندوستانی خواتین کے کارنامے کسی سے کم نہیں ہیں۔ قدیم ہندوستان میں بھاسکر آچاریہ جیسے عظیم ریاضی داں کی بیٹی لیلاوتی خود ایک عظیم ریاضی داں اور ماہر علم نجوم تھیں۔ کادمبنی گانگولی وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے کلکتہ میڈیکل کالج سے میڈیکل سائنس میں گریجویشن کرنے کے بعد برطانیہ میں میڈیکل ٹریننگ حاصل کی۔ ان کے علاوہ راجیشوری چٹرجی، ڈاکٹر اندرا ہندوجہ، انا منی وغیرہ وہ خواتین ہیں جنھوں نے سائنس کی دنیا میں کار ہائے نمایاں انجام دے کر ملک کا نام روشن کیا۔

Kulsum Fatma Nasir
Guest Faculty(English) L.E.C.
Near Damodar Hostel
JNU, New Delhi-110067

عشرت رسول

کشمیر کی خواتین فکشن نگاروں کے فکشن میں

احتجاجی اور مزاحمتی رویہ

"ادب کی تخلیق کا مقصد ہی زندگی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کی ترجمانی کرنا ہے۔اپنے اس منصب پر جو ادب جتنا زیادہ پورا اترتا ہے وہ زندگی کی بہتر تصویر کشی اور ترجمانی کر پاتا ہے ۔یہ ایک ایسا کلیہ ہے کہ دنیا کے تمام ادب میں اس کی مثالیں نہایت ہی نمایاں اور فراواں ہیں"

ادب تخلیق کرنا، بذاتِ خود ایک احتجاج اور مزاحمتی عمل ہے۔اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے سارا ادب مزاحمتی اور احتجاجی عمل ہے اور ہر ادیب باغی:

میں تو یہاں گانے آیا ہوں
اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ گاؤ

پابلو نیرودا جب یہ کہتا ہے تو دراصل وہ کھل کر سانس لینے کی بات کرتا ہے۔چند روز زندگی کو آزادی سے بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس دنیا کو آرام دہ اور پرسکون گھر کی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔لیکن یہ آزادی کہاں؟ انسانی تاریخ اس آزادی کو سلب کرنے والی قوتوں اور آزادی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف لوگوں کی باہمی کشمکش سے بھری پڑی ہے۔استحصال اور جبر کی بے شمار قوتیں ہیں۔بین الاقوامی سطح پر مضبوط اقوام، کمزور قوموں پر اپنا شکنجہ جمائے رہتی ہیں۔ہر سماج میں بالادست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ریاست کے نام پر، سیاست کے نام پر معیشت کے نام پر اور ان استحصالی قوتوں کے جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے۔

احتجاج اور مزاحمت انسانی فطرت کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ ادب سے قطع نظر اگر ہم انسان کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں احتجاج اور مزاحمت کا سراغ ملتا ہے۔بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ پتھر کے عہد میں جنگل قانون (rule of jungle) میں جہد للبقاء (struggle for existence) اور surivival of the fittest رائج تھا۔تہذیب و تمدن کے آغاز کے ساتھ ساتھ درج بالا قوانین کو تبدیل ہونا چاہیے تھا۔لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور آج کے ترقی یافتہ عہد میں بھی یہ قوانین اپنی بدترین شکل میں موجود ہیں۔

ادب کی تخلیق کا مقصد ہی زندگی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کی ترجمانی کرنا ہے۔اپنے اس منصب پر جو ادب جتنا زیادہ پورا اترتا ہے وہ زندگی کی بہتر تصویر کشی اور ترجمانی کر پاتا ہے۔یہ ایک ایسا کلیہ ہے کہ دنیا کے تمام ادب میں اس کی مثالیں نہایت ہی نمایاں اور فراواں ہیں۔

ترنم ریاض ریاست جموں و کشمیر کی اہم ادیبہ ہیں جن کے افسانے نہ صرف وادی کشمیر میں شہرت رکھتے ہیں بلکہ اُردو دنیا میں نسائی ادب کے حوالے سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز 1973 میں ہوا لیکن اُن کی پہلی کہانی روزنامہ "آفتاب" میں 1975 میں شائع ہوئی۔کہانی لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے وہ ایک معتبر شاعرہ، ناول نگار، محقق و نقاد کی حیثیت سے اپنی لیاقت و قابلیت کا لوہا منوا چکی

ہیں۔ ہندوپاک کے معتبر ادبی رسائل میں ان کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ تنقید وتحقیق کے تعلق سے ان کی دو کتابیں ''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب'' اور ''چشم نقشِ قدم'' شائع ہو چکی ہیں۔ ترنم ریاض ملک کی کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ گذشتہ بیس برسوں سے ٹی وی اور ریڈیو سے اُردو میں خبریں پڑھنا ان کی مصروفیات کا ایک حصہ ہے۔ وہ کئی انعامات حاصل کر چکی ہیں ان میں ریاستی کلچرل اکادمی کا BEST BOOK AWARD بھی شامل ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کہانی کا خاکہ تیار کرنے میں کوئی زیادہ قوت اور وقت صرف نہیں کرتیں بلکہ کسی تصنع یا بناوٹ کے بغیر کہانی گڑھتی ہیں۔ وہ موجودہ دور کے انسانی نفسیات، ضروریات، خواہشات کو تمام ترفنی لوازمات کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات ہمیشہ تروتازہ اور نئے ہوتے ہیں اپنے کرداروں کے اندر اُتر کر ان کے وجود میں پوشیدہ کہانیوں کو باہر نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیری تہذیب وتمدن، کشمیر کی خوبصورتی، کشمیریوں کے مسائل اور ان کے درد وکرب کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ظلم وجبر اور تشدد کے پس منظر میں لکھے گئے ان کے افسانے کسی آشوب نامہ سے کم نہیں۔ ایسے پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں سے مقامی، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی صورتِ حال کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

''متاعِ گم گشتہ''، ''بابل'' اور ''برف گرنے والی ہے'' جیسے افسانے کشمیری عوام کی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کے افسانوں میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل اور رُخ موجود ہیں وہ عورت کی بھرپور نمائندگی اور وکالت کرتی ہیں۔ انھیں عورت کی عظمت اور خوبیوں کا احساس ہے وہ انسانی زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان نے تہذیب وشائستگی کی منزلیں کس طرح طے کی ہیں مگر اس بات کا بھی وہ شدید احساس رکھتی ہیں کہ موجودہ دور میں انسان کی شناخت کس طرح مسخ ہو رہی ہے۔

افسانہ ''کشتی'' میں کشمیر کے خراب حالات کی وجہ سے کس طرح لوگوں کو مختلف مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے گولی اور بارود سے لوگ کس طرح کی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں انہی باتوں کو موضوع بنا کر کشمیر کے تہذیبی وثقافتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔

''یمبرزل'' ان کا ایک اہم ناول ہے جسے کشمیر کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ کشمیری تہذیب وثقافت، تاریخ رہن سہن اور کشمیریت کے حوالے سے ترنم ریاض کا یہ ایک شاہکار ناول ہے اس میں کشمیر کے عوام کے دکھ درد اور مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ''یوسف'' ہے جس کے ماں باپ اپنے آخری سہارے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

> **''ترنم ریاض کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کہانی کا خاکہ تیار کرنے میں کوئی زیادہ قوت اور وقت صرف نہیں کرتیں بلکہ کسی تصنع یا بناوٹ کے بغیر کہانی گڑھتی ہیں۔ وہ موجودہ دور کے انسانی نفسیات، ضروریات، خواہشات کو تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات ہمیشہ تروتازہ اور نئے ہوتے ہیں اپنے کرداروں کے اندر اُتر کر ان کے وجود میں پوشیدہ کہانیوں کو باہر نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیری تہذیب و تمدن، کشمیر کی خوبصورتی، کشمیریوں کے مسائل اور ان کے درد وکرب کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے''**

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترنم ریاض افسانہ نگاری کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے ارد گرد جو ماحول دیکھا اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں کہانی، پلاٹ، کردار اور واقعہ نگاری، جذبات نگاری، اسلوب منظر نگاری کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اکثر نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرنے کے بعد ان موضوعات کو آپ بیتی اور جگ بیتی میں مدغم کر کے ایک نئے انداز سے افسانوں میں پیش کیا۔

عصر حاضر کے فکشن نگاروں میں ایک نام زنفر کھوکھر کا ہے، زنفر کھوکھر کا ادبی سفر کافی طویل نہیں ہے۔ دراصل ان کی مادری زبان پہاڑی ہے اور وہ اس زبان میں لکھتی تھیں لیکن بعد میں اُنھوں نے اُردو کے رسائل پڑھنے شروع کیے جن کو پڑھ کر انھیں اُردو سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھیں اُردو میں لکھنے کی تحریک ملی ان کا کہنا ہے کہ ان کے خاندان میں کوئی ادیب یا شاعر نہیں گزرا۔ لیکن جب یہ اُردو کے نامور ادیبوں جیسے پطرس بخاری،

رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، کرشن چندر وغیرہ کے بارے میں رسائل میں پڑھتی تھیں تو ان میں اُردو میں کچھ لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خود افسانہ کی طرف مائل ہوگئیں۔

زنفر کھوکھر کی پہلی اُردو کہانی کا عنوان ''تحفہ'' ہے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' 1999 میں شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس افسانوی مجموعہ میں شامل افسانوں میں اُنھوں نے عصری آگہی، عام فہم اسلوب بیان اور زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے واقعات پیش کیے۔جس کی بنا پر اس مجموعہ کو کافی پسند کیا گیا۔زنفر کھوکھر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''کانچ کی سلاخ'' کے نام سے 2003 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں زنفر کے ایسے افسانے شامل ہیں جن میں عصر حاضر کے انسان کے دُکھ درد، ہمارے سماج اور معاشرے میں موجود انتشار اور خصوصاً عورتوں کے مسائل مثلاً اس کے سسکتے ارمانوں اور نفسیاتی کشمکش اور گھٹن کا حال، لوگوں کا استحصال، رسم و رواج کی پابندیاں، تعلیم کی اہمیت اور عورت کی خوش حال زندگی کا خواب ایسے موضوعات ہیں جن پر زنفر کھوکھر نے افسانے لکھے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ان کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''کانچ کی سلاخ'' میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ زنفر کھوکھر صوبہ جموں کی ایک ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھیں کہانیوں کی بنت کا فن آتا ہے۔زنفر کھوکھر کے افسانوں میں محسوسات اور احساسات کے کئی پرتو دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور زندگی سے وابستہ گوناگوں مسائل پر غور و فکر کرتا ہوا ذہن اُن کے پاس موجود ہے''۔

(زنفر کھوکھر، افسانوی مجموعہ، کانچ کی سلاخ، فلیپ کور)

زنفر کھوکھر اپنے گرد و پیش کے واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے تمام اسرار و رموز کی مضبوط گرہیں کھولنے کی کوشش میں اپنی کہانیوں کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔زنفر کھوکھر نے افسانہ ''فیصلہ'' لکھ کر تانیثی فکر و شعور کو اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے جذبات و احساسات کی بڑی موثر عکاسی کی ہے۔ان کا اس بات پر یقین ہے کہ:

عورت کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے بالآخر وہ حالات، وقت اور مرد کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہے۔

''کانچ کی سلاخ''، ''سمجھوتہ''، ''بندھن''، ''دستک''، جواز'' اور ''راہ کا روڑا'' ان کی اہم کہانیاں ہیں۔

زنفر کھوکھر کی اکثر کہانیوں کا موضوع ایک عورت ہے وہ عورت جو مختلف سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل میں گھری ہوئی ہے اپنے افسانوں کے ذریعے وہ عورتوں کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتی ہیں جب ایک عورت کی شادی ہوتی ہے تو وہ سسرال کو جنت بھی بنا سکتی ہے اور جہنم بھی۔وہ اپنے افسانوں کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ وہ پڑھیں لکھیں، حالات و واقعات کی نزاکت کو سمجھیں اپنی انا اور جذبات کو قابو میں رکھیں، شکوہ شکایت اور دُہائی دینے کے بجائے سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی سے معاملات حل کرنے کی سعی کریں۔

زنفر کھوکھر کے افسانوں کے کردار بڑے جاندار اور متحرک ہوتے ہیں۔کیوں کہ ان کے کردار اپنی ذات کے کرب کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں'' کچھ نہیں'' اور'' خاموشی'' میں زنفر کھوکھر نے عورتوں کی نفسیات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔'' کچھ نہیں'' کی نازیہ اور'' خاموشی'' کی صائمہ یا راشد چھوٹی بیگم کے کردار ہمارے دیکھے ہوئے کردار ہیں جو داخلی سطح پر اپنا کرب اُبھارتے چلے آتے ہیں۔

زنفر کھوکھر نے اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے بُرے لمحوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے رموز و اسرار کی گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے ان کے افسانے سماج میں پل رہے بے چارگی، بے بسی، غصہ، ہلاکتیں وغیرہ کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔'' یادیں''، '' حادثہ''، '' کچھ نہیں''، '' خاموشی'' اور'' سمجھوتہ'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں عورت کے استحصال کی داستان بیان کی گئی ہے۔

ان کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے سماج یا گرد و پیش میں جو بھی واقعات یا حادثات پیش آئے اُن کا مشاہدہ کر کے اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے افسانے سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کے افسانے محسوس اور غیر محسوس طریقے سے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کے اُردو فکشن نگاروں میں ایک جانا پہچانا نام نعیمہ احمد مہجور کا بھی ہے۔نعیمہ احمد مہجور مشہور فکشن نگار ہیں ان کا شمار جدید افسانہ نگاروں کی اس نسل میں ہوتا ہے جو نام و نمود سے پرے اپنا ادبی سفر

خاموشی سے طے کرتی رہیں، اُنھوں نے وہی کچھ لکھا جوان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ان ہی کرداروں کو پیش کیا جو ان کے اطراف میں موجود تھے۔نعیمہ احمد نے اپنے افسانوں میں وادی کے خوبصورت اور دلکش نظاروں کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ ریاستی عوام کے مسائل، جہالت، بھوک، افلاس اور احساسِ محرومی وغیرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات وحالات کی ستم ظریفی کبھی تجربوں کی صورت میں اور کبھی مشاہدے کی صورت میں جو کچھ دیکھا اسے افسانوں کی صورت میں پیش کردیا۔

انھوں نے متعدد افسانے تخلیق کیے جو مختلف اخبار و رسائل میں چھپتے رہے اور شرف قبولیت حاصل کرتے رہے ہیں جن میں ''اس بستی کی بات''، ''دائرے''، ''سمتوں کی تلاش''، ''پتھر کی دُنیا''، ''پچھتاوے کا رونا''، ''وہاں سے یہاں تک''، ''تلاش کس کی''، ''چند لمحے''، ''آگ''، ''سیاہ رات کی چاندنی''، ''سفید چاندنی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔نعیمہ احمد مہجور نئی ادبی نسل کی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے زیادہ تر موجودہ مابعد جدیدیت کے دور میں لکھے گئے۔1980 کے بعد اُردو میں مابعد جدیدیت کی نشاندہی ممکن ہوئی ہے۔نعیمہ احمد مہجور مابعد جدیدیت کے عہد کی نمائندگی کرتی ہیں وہ مقامی اور غیر مقامی سطحوں پر سیاست دانوں کی بالادستی، معاشرتی گھٹن اور اقتصادی درہمی کا قریب سے مطالعہ کرتی ہیں۔

نعیمہ احمد نے اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق اور زندگی کی بے رحم سچائیوں کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔اُنھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی کی ہے اور بھوک، افلاس اور بے روزگاری جیسے مسائل کا احساس بھی دلایا ہے۔وہ زندگی کا مشاہدہ ایک ہمدرد قلم کار کی طرح کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں عوام کی زندگی، ان کی جدوجہد، ان کے جذبات، ان کے رنج وغم، ان کی حسرتیں اور تمنائیں سبھی کچھ ملتا ہے۔ان کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا درد و کرب، خون خراب اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

نعیمہ احمد اپنی کہانیوں میں عصرِ حاضر کی سماجی بداعمالیوں اور اقدار کی پامالیوں کا ذکر دلکش اسلوب کے ذریعے کرتی ہیں۔وہ اپنے افسانوں کے ذریعے ناقص تعلیمی نظام کے خلاف بغاوت کرتی نظر آتی ہیں ان کے افسانوں میں تانیثیت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے وہ آج کی عورت کی زندگی کی بے شمار تلخیوں کو اپنے افسانوں میں سمیٹتی نظر آتی ہیں۔انھوں نے چونکہ مختلف علاقوں کے لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے یہاں کے لوگوں کی زندگی کے نشیب وفراز، غربت، مفلسی اور یہاں کے عوام پر ہو رہے مظالم اور زیادتیوں کو موضوع بنا کر فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتی ہیں کہ عورت کو ابھی تک وہ حق نہیں ملا ہے جس کی وہ مستحق ہے اس کے علاوہ انھوں نے عورتوں کی نفسیات کی موثر ترجمانی بھی کی ہے۔عورتوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے وقت انھوں نے ماں، بہن، بیوی اور محبوبہ وغیرہ کے جذبات کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔

''پتھر کی دُنیا'' ان کا اہم افسانہ ہے اس افسانے میں اُنھوں نے ثریا نامی ایک لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے گاؤں کے ایک لڑکے سے پیار کرتی ہے۔لیکن وہ اپنی محبت سے زیادہ اپنے مستقبل کو ترجیح دیتا ہے اور اس لڑکی کو بیچ راہ میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس افسانے میں نعیمہ احمد نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ثریا کا محبوب اسے صرف اس لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکی ہے اس سے محبت کا وعدہ کر کے دھوکا دیتا ہے اور جب اسے پچھتاوا ہوتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور ثریا کے شوہر کے انتقال کے بعد اسے وہ دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے یہاں ثریا کے احتجاج کے ذریعے نعیمہ احمد مہجور نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت چاہے کتنی ہی بے بس اور مجبور کیوں نہ ہو وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتی اور اس کے ساتھ ہوئے دھوکے کو کبھی نہیں بھول پاتی۔ثریا کے اس فیصلے کو نعیمہ احمد نے ثریا کے احتجاج کی صورت میں پیش کیا ہے۔

''ضرورت مند'' نعیمہ احمد کا ایک اہم افسانہ ہے۔نور اس افسانے کا مرکزی کردار ہے پوری کہانی اس کے اردگرد گھومتی ہے۔اس میں نور کے داخلی کرب کو بیان کیا گیا ہے۔مصنفہ نے عورت کی بے بسی کو مختلف روپ میں پیش کیا ہے مثلاً عورت جب لڑکی ہوتی ہے تو والدین کی خدمت اس کا مقصد بن کے رہ جاتا ہے اور جب بیاہی جاتی ہے تو شوہر کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے ظلم وستم کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور جب وہ ماں بنتی ہے تو اپنے بچوں کی زندگی سنوارنے کے لیے اُسے کبھی لالچی اور خود غرض بھی بننا پڑتا ہے۔اس طرح اس میں نور کے دُکھ درد اور دل کی داستان بیان کی گئی ہے۔

نعیمہ احمد مہجور نے ایک ناول ''دہشت زادی'' بھی لکھا ہے اس ناول میں کشمیر کی سیاسی کشمکش سے لے کر یہاں کی متاثرشدہ عوام کی دلسوز کہانی کو ایک المیہ کے ذریعے پیش کیا ہے۔جس سے یہاں کے حالات کی حقیقی تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار خود مصنفہ ہے، جو زندگی کے پہیے میں ریشم کی ڈور کی طرح پھنس جاتی ہے اور کئی دہائیوں تک الجھی ہی رہتی ہے۔ان گزری دہائیوں میں اس کی زندگی

جیسے تاریخ کے اوراق پہ لکھی تحریر کی طرح یہاں کے حالات کی شاہد بن جاتی ہے۔ جو کچھ اس کی آنکھیں اس سرزمین پر دیکھتی ہیں وہ کہانی اس کے کردار کے ذریعے اس ناول میں بیان ہوتی ہے۔ مذکورہ کردار کی زندگی ایک طرف سماجی بندھنوں سے بندھی ہوتی ہے تو دوسری طرف حقوق نسواں کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف جدوجہد آزادی کا حصّہ بن جاتی ہے تو دوسری طرف اپنے ہی گھر میں مظلوم اور لاچارگی کی زندگی گزارتی ہے۔ حقوق نسواں کی پہلی جنگ وہ تب فتح کرتی ہے جب فائزہ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گھر میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں لیکن وہ یہ جنگ جیت جاتی ہے۔

کشمیر میں عورتوں کو اپنے حقوق کی جنگ لڑنی پڑتی تھی۔ کیوں کہ حالات نے ان کے حقوق کو اس طرح سے پامال کیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں بولنے کا حق بھی نہیں رکھتی تھیں۔ ان حقوق کی پامالی کو مصنفہ ایک جگہ یوں بیان کرتی ہیں:

> ''کیا ہمارے گھر میں ایسا کچھ ہو رہا ہے جو میں فوجیوں کو بتا دیتی؟ ایک لمبی خاموشی کے بعد میری زبان سے یہ بے تکے الفاظ نکل پڑے۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا سمندر موجزن ہے اور جیسے مجھے ابھی مار دے گا۔ میں ایک بچے کی طرح ہوں جو ڈراونے خواب کو دیکھ کر سہم گیا ہو اور کسی کا دامن پکڑ کر خود کو چھپانا چاہتا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کی ٹک ٹکی میں قید ہوتی جا رہی ہوں۔ کتنی ناانصافی ہے تمام لوگ صرف مجھے ہی ٹک ٹک دیکھتے جا رہے ہیں۔ سڑک پر فوجی کی نگاہیں مجھ پر ٹکی ہیں، گھر میں اسد مجھے گھور رہا ہے اور بابا کے پاس جاؤں تو وہاں اُن کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوتی ہیں، میں کس کس کی نظروں سے اپنے آپ کو بچاؤں اِن سب کی نظریں میرا تعاقب کرتی ہیں مجھے تار تار کرتی ہیں، مجھے ذہنی مریض بنا رہی ہیں، مجھے بے چین کرتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ آخر سب مجھ سے چاہتے کیا ہیں''۔

(نعیمہ احمد مہجور، دہشت زادی، میزان پبلیکیشنز، سرینگر، 2012، ص64)

الغرض 1990 کے ان ہنگامی حالات نے بہت سارے مسائل کو جنم دیا تھا جن میں مذہبی فرقہ واریت، خواتین کے حقوق کی پامالی، نسل کشی، نفسیاتی و ذہنی بیماری، سماج میں عدم اعتمادی، معاشی بدحالی، تعلیمی فقدان، تہذیبی بحران، عصمت دری، قتل و غارت گری اور دیگر کئی انسانیت سوز مسائل نے جنم لیا تھا جس سے یہاں کی عوام کلی طور پر متاثر ہی نہیں بلکہ اس کا بھرپور شکار بھی ہوئیں۔ مصنفہ نے اس ناول میں ان تمام مسائل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔

> **''نیلوفر ناز کی مختصر کہانیاں قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔وہ کہانی میں تجسس و تسلسل برقرار رکھنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے افسانوں میں ڈرامائی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔زبان وبیان کے معاملے میں بھی انھوں نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔عام فہم سیدھی سادی زبان اور سپاٹ اندازِ بیان قاری کو ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا،،**

نیلوفر ناز نحوی کشمیر میں موجودہ دور میں اُبھرنے والی خواتین افسانہ نگاروں میں جانا پہچانا نام ہے۔ ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی موجودہ دور کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں ان کے زیادہ تر افسانے مابعد جدیدیت کے دور میں لکھے گئے۔ وہ اپنے افسانوں میں اسی دور کی نمائندگی کرتی ہیں وہ زیادہ تر مقامی سطح پر ان گھریلو انتشار کو موضوع بناتی ہیں جو نئی نسلوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس طرح مقامی کلچر کے پس منظر میں پیدا ہونے والے واقعات و حالات کو افسانوی صورت حال عطا کرتی ہیں۔

اُنھوں نے کشمیر کے پُرآشوب غم اور واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے حقائق کو اِسی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''چنار کے برفیلے سائے'' میں شامل کہانی ''برتھ ڈے'' ایک بیٹے اور چار بیٹیوں کی کہانی ہے۔ خورشید اور سلیمہ کے یہاں چار بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے تو سارے گھر میں خوشیاں بکھر جاتی ہیں اور جب بیٹا نو سال کا ہو جاتا ہے اسی دوران گولیاں چلنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے چار بہنوں کا لاڈلا بھائی خون میں لت پت اپنی ماں کے ہاتھوں میں آخری سانسیں لیتا ہے۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چنار کے برفیلے سائے'' 2003 میں شائع ہوا۔ اس میں 24 مختصر افسانے اور 15 افسانچے شامل ہیں اپنے پہلے مجموعہ کے ساتھ ہی وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہوئیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''خاموش آسماں'' 2015 میں شائع ہوا۔ جس میں 23 مختصر افسانے شامل ہیں۔ نیلوفر ناز کی مختصر کہانیاں قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ کہانی میں تجسس و تسلسل برقرار رکھنے کے ہنر سے بخوبی واقف

ہیں۔ان کے افسانوں میں ڈرامائی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔زبان و بیان کے معاملے میں بھی انھوں نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔عام فہم سیدھی سادی زبان اور سپاٹ اندازِ بیان قاری کو ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا۔

نیلوفر ناز نحوی کے افسانوں کا بطور مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانے اس عورت کو فوکس کرتے ہیں جو نسائیت سے بھرپور سوچ رکھتی ہے وہ اپنے افسانوں میں عصری معاشرے سے عدل و انصاف کی طلب گار نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں افسانہ ''تم نہیں اور سہی''، ''تلاش''، ''تیسری بیٹی'' اور ''کھوٹا آدمی'' بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیلوفر ناز نحوی کا افسانوی سفر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوا ہے کشمیر کے پُر آشوب دور کے تعلق سے بھی انھوں نے نہایت درد بھرے افسانے قلمبند کیے ہیں، انھوں نے اپنے آس پاس کے ماحول اور خاص کر اپنے مادرِ وطن کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور عوام کے دُکھ درد کو اپنے مختصر افسانوں میں نہایت خوبصورتی سے سمویا ہے۔وہ بھی عصر حاضر کی افسانہ نگاروں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت جانی پہچانی جاتی ہیں۔

اس مختصر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں دورِ حاضر میں فکشن نگاری کی طرف کئی خواتین فکشن نگار توجہ دے رہی ہیں اور اپنے افسانوں کے ذریعے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

□□□

Ishrat Rasool
Research Scholar
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

اے جذبہ دل گر میں چاہوں۔۔۔!

شاد بیٹا!۔۔۔جی اماں...... ادھر قریب آؤ میرے لعل۔۔۔بہت دیر تک اپنے گھر کے اطراف کا ٹکٹکی باندھے جائزہ لینے کے بعد صابرہ بیگم نے اپنے اکلوتے فرزند کو آواز دی تھی، جیسے آج وہ کوئی اہم بات کہنے والی ہو۔جی اماں!۔۔۔اور شاد سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بوڑھی اور نحیف ماں کے قریب بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا......اس نے غور سے اپنی ماں کو دیکھا، یہ وہی صابرہ تھی جس کی پوری زندگی جہد مسلسل اور مختلف آزمائش سے لبریز تھی۔مگر کبھی ان کے چہرے پر شکن نہیں آئی، ہر آزمائش کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔شاد نے محسوس کیا کہ آج اس بہادر خاتون کے چہرے پر تفکرات کے آثار نمایاں تھے۔کئی ماہ سے صاحب فراش اس کی والدہ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔بیٹا!۔۔۔بڑھاپا کوئی عجوبہ نہیں ہے، ایک نہ ایک دن ہر فرد و بشر کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بڑھاپا بیماری بھی نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ 'نسل نو' خود کے لیے اور بیوی، بچوں کے لیے مضر صحت سمجھ کر بزرگوں کو اپنے دل اور گھر سے نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔اور جو نہیں نکالتے وہ انھیں اپنے آپ پر ایک 'بوجھ' سمجھتے ہیں۔بہت ہی خوش نصیب ہیں وہ ماں باپ جن کی اولاد تمھاری طرح سعادت مند ہو۔یہ خدا کا فضل ہے، اس لیے مجھے تم پر ناز ہے

"شاد کے سامنے ایک بوڑھا زخمی ابھی تک حالت بے ہوشی میں پڑا تھا جسے ابھی ابھی وہ سڑک کے کنارے سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔ جب تک ڈاکٹر آتے، اماں جی کے کہے ہوئے یہ آخری کلمات "حتی المقدور بے بسوں کی مدد کرنا۔" مستقل اس کے ذہن ودماغ میں گشت کرتے رہے۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے، مگر ہر بار اماں جی کے وہ نصیحت آموز جملے اس کی راہ میں حائل رہے"

بیٹا۔۔۔شاد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صابرہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ کچھ لوگ بڑھاپے کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں، چونکہ ان کے پاس اس سے زور آزمائی کے لیے قوت و اسباب دونوں ہوتے ہیں۔اور کچھ لوگ مجبوری کے سبب اس کا مقابلہ کرنے سے چاہ کر بھی قاصر رہتے ہیں، مگر بڑھاپا امیر اور غریب سبھی پر ظاہر ہوتا ہے۔اس عمر میں یادِ خدا بہت آتی ہے۔معلوم ہے کیوں؟ کیونکہ موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔۔۔خیر یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔صابرہ کے چہرے پر ہلکی مسکان تھی، پھر اس نے یہ شعر پڑھا۔۔۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

شاد! صابرہ کی ان باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا، اسے یہ بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ اب اماں کا وقت قریب آپہنچا ہے، اس لیے آج وہ ایسے نصیحت آموز کلمات ادا کر رہی ہیں۔اس سے پہلے انھوں نے اتنی سنجیدہ گفتگو نہیں کی تھی۔یہاں تک کہ اپنی پریشانی کا اظہار بھی شاد سے اس انداز میں نہیں کیا تھا۔بیٹا! تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔؟ اور اب کی بار شاد کے ضبط کی باندھ ٹوٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے اشکوں کے چند گرم

قطرے صابرہ کی پیشانی پر گر پڑے۔ وہ اپنی زبان سے تو کچھ نہیں کہہ سکا، لیکن ماں کے دل نے سب کچھ محسوس کرلیا۔ نہیں شاد! بیٹے...... تم کو خدا نے مرد بنایا ہے اور مرد کا دل اتنا کمزور نہیں ہوتا ہے۔ جواں مرد تو اپنے عزم اور ارادوں سے پہاڑ کا دامن چیر دیتے ہیں، دریاؤں میں راستہ بنا لیتے ہیں۔ شاد! یہ تو قانون قدرت ہے اور یہاں رہنے کے لیے آیا ہی کون ہے؟ یہ دنیا تو فانی ہے، بے وفا ہے۔ یہاں کی سب چیزیں آنی جانی ہیں۔ صابرہ کی سانس اکھڑنے لگی تو شاد نے سہارا دے کر انھیں بٹھایا اور پانی پلایا۔ اماں! آپ آرام کریں۔ شاد بیٹا! مال و دولت کوئی بھلی چیز نہیں ہے اس کے حصول کی خاطر کبھی جھوٹ مت بولنا۔ غریبوں کی دلجوئی اور بڑوں کی عزت کرنا بھی بڑی نعمت ہے۔ منہ پر کچھ، پیٹھ پر کچھ والی صفت اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دینا۔ حتی الامکان کمزور اور بے سہارا لوگوں کی اعانت کرنا اور صبر و شکر کا دامن کبھی نہ چھوڑنا، میری ان باتوں پر عمل کروگے تو پریشانی اور حالات مصائب میں بھی خوش و خرم رہوگے۔ خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔۔۔ شاد کے سامنے ایک بوڑھا زخمی ابھی تک حالت بے ہوشی میں پڑا تھا جسے ابھی ابھی وہ سڑک کے کنارے سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔ جب تک ڈاکٹر آتے، اماں جی کے کہے ہوئے یہ آخری کلمات ”حتی المقدور بے بسوں کی مدد کرنا۔“ مستقل اس کے ذہن و دماغ میں گشت کرتے رہے۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے، مگر ہر بار اماں جی کے وہ نصیحت آموز جملے اس کی راہ میں حائل رہے۔ ڈاکٹر صاحب! یہ بوڑھا، شاید کسی گاڑی سے ٹکرا گیا ہے۔ شاد نے خون میں نہائے ہوئے اور بے ہوش بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ تمھارا کون ہے؟ اور رات میں اسے اکیلے سیر کرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ ڈاکٹر صاحب! یہ میرا کوئی نہیں ہے، میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ سیر کرنے کے لیے نکلا تھا یا کسی ضروری کام سے۔ میں ڈیوٹی سے واپس آرہا تھا کہ اچانک اس پر میری نگاہ مرکوز ہوگئی۔ اُف اوہ! تو یہ تمھارا کوئی نہیں ہے؟ ڈاکٹر نے لمبی سانس لے کر کہا۔ نہیں تو چھوڑ دیے ہوتے وہیں، کیا ضرورت تھی اسے یہاں لانے کی۔ ویسے بھی اس کے پاس علاج کرانے کی سکت معلوم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب! آپ روپے کی فکر بالکل مت کیجیے، بس فوری طور پر ان کا علاج شروع کریں۔ شاید ان کا خون ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر منہ بناتا ہوا بادل ناخواستہ اس کی طرف متوجہ ہوا...... چند ساعت بعد ڈاکٹر نے شاد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ جناب! اب خطرے کی کوئی بات نہیں اور چوٹ بھی کوئی خاص نہیں ہے، مگر چونکہ ضرب دماغ پر ہے اس لیے معمولی کہنا بھی مناسب نہیں۔ یہ دوائیں آپ جلد لے آئیں، تب تک میں ان کا زخم صاف کرتا ہوں۔ قریب کی ڈسپنسری سے دوائیں لے کر شاد نے ڈاکٹر کو دی اور پھر گھر چلا آیا۔ مگر نیند اسے پوری رات نہیں آئی۔ رات بھر اس کا ذہن اس بوڑھے مریض کی طرف لگا رہا اور پھر منہ اندھیرے وہ سب سے پہلے اسپتال پہنچ گیا وہاں بوڑھے کو ہوش میں دیکھ کر اسے کسی قدر تسلی ہوئی۔ ڈاکٹر انھیں ڈوز دے کر شاید جانے ہی والا تھا۔ یہ لیجیے چچا۔ آپ جن کے لیے پریشان تھے وہ یہی ہیں۔ انھوں نے ہی آپ کو رات گئے سڑک سے اٹھا کر یہاں تک پہنچایا اور ساری دوائیں خرید کر مجھے دی ہیں۔ ان سب باتوں کو چھوڑیے ڈاکٹر صاحب۔ پہلے یہ بتائیے فی الحال ان کی طبیعت کیسی ہے؟ دیکھیے جناب میں جانے ہی والا تھا، اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ ویسے میں نے ان کو دوا اور احتیاط کے تعلق سے پوری بات سمجھا دی ہے اب چونکہ خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہی اس لیے آپ چاہیں تو انھیں لے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد شاد بوڑھے کی طرف متوجہ ہوا۔ بابا، میرا نام شاد علی ہے۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میرا گھر یہیں پر ہے اس وقت آپ وہیں چلیں۔ بیٹا! اس بوڑھے نے پہلی مرتبہ اپنی لڑکھڑاتی زبان سے کچھ کہا...... تم جو اتنا سب کچھ کر رہے ہو...... اس سے آگے شاد نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بابا۔۔۔ میں آپ کے کچھ کام آؤں یہ میری خوش نصیبی ہے۔ میرے متعلق بالکل بھی نہ سوچیں، آپ جیسے لوگوں کی خدمت کا موقع ملتا ہی کب ہے، وہ بھی اس زمانے میں جہاں اپنے بھی اب اپنے نہیں رہے۔۔۔ اس مطلب بھری دنیا میں ہر جگہ مکر و فریب کا جال بچھا ہوا ہے جس میں کون کب پھنس جائے کہنا مشکل ہے۔ شاد کے اپنائیت بھرے جملے کو سن کر بزرگ کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں یکلخت چھلک پڑیں۔۔۔ اے پاک ذات! انسانیت ابھی زندہ ہے۔۔۔ دل ہی دل میں اس نے کہا۔۔۔ شکر خداوندی سے ان کی پلکیں جھک گئیں۔ بہتر دیکھ بھال کے لیے شاد انھیں اپنے ساتھ گھر لے آیا۔۔۔ بابا کو لٹا کر سب سے پہلے انھیں دوا دی اور آفس جانے کے لیے اجازت چاہی۔۔۔ ویسے آج میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا، مجھے نہیں لگتا کہ کام میں دل لگے گا، مگر کچھ مجبوری ہے۔ آفس کی بہت ساری ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر ہیں، اپنے باس کے اعتماد اور اعتبار کا پاس رکھنا ضروری ہے بابا، وہ مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ بیٹے کوئی بات نہیں، تمھاری بے انتہا ہمدردی کا نتیجہ ہے کہ اب تک تم نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ بابا کوئی پریشانی؟ بلا جھجک بولیے۔۔۔ نہیں بیٹے پریشانی کو تم نے آنے ہی کب دیا ہے...... ایک ضروری بات جو کہنا چاہ رہا ہوں، لیکن

کہنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہا ہوں۔۔۔دراصل میری بیٹی بہت پریشان ہوگی، کل رات اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور میں اس کی دوا لینے کے لیے ہی نکلا تھا، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔۔۔اللہ جانے وہ کس حال میں ہے۔ایسا کرو مجھے بھی لیتے چلو، میں اس کے بنا ایک پل یہاں نہیں رک سکتا۔۔۔بیٹے وہی میری کل کائنات ہے۔ بابا نے لرزتے ہونٹوں سے کہا اور بیٹی کے تئیں تشویش کا اظہار کیا۔نہیں بابا۔۔۔فی الوقت آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے، اگر آرام نہیں ملا تو طبیعت مزید بگڑ سکتی ہے۔زخم تازہ ہے، ادنیٰ سی عدم توجہی سے صحت خراب ہوسکتی ہے، ویسے ہی دیر ہونے کی وجہ سے جسم سے کافی خون بہہ چکا ہے۔۔۔آپ پتہ بتا دیں میں ہی اسے لیتا آؤں گا۔ ڈیوٹی سے واپسی پر شاد پتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بابا کے گھر تک پہنچ گیا...... مٹی کے اس مکان کی حالت خاصی خستہ تھی، چہار دیواری کے نام پر ٹوٹی پھوٹی دیواریں بس کسی طرح ٹکی ہوئی تھیں، جبکہ اس کے آس پاس کے مکانات کوٹھی نما تھے، جنھیں دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ یہ مکان بھی اسی محلے کا حصہ ہے۔ یہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ایک کمزور دروازہ جو بند تھا شاد نے اسے کھٹکھٹایا، مگر اندر سے کوئی حرکت نہیں ہوئی، تھوڑے توقف کے بعد اس نے زور سے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔شاد نے جان بوجھ کر بلند آواز سے سلام کیا اور اندر داخل ہوگیا۔مکان کی حالت اندر بھی ویسی ہی تھی، آنگن حالانکہ بڑا تھا، لیکن اجڑے چمن کی مانند، جیسے خوشیوں کے لیے یہ گھر اور صحن ترس رہا ہو۔ایک کونے میں امرود اور انار کا درخت جس پر پھل لدے پڑے تھے، جسے دیکھ کر ہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں ہوتی۔ورنہ درختوں پر پھل اس طرح بھرے پڑے نہیں رہتے۔مکان کے اندر بھی بالکل باہر جیسا سناٹا تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں رکھی چارپائی پر ایک لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں دراز تھی...... جس کے بال بکھرے ہوئے اور پورا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا...... اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔اس بے ترتیب حلیہ سے لگ رہا تھا کہ وہ کتنی پریشان ہے۔معاف کیجیے گا، میں بغیر اجازت کے اندر آگیا ہوں...... دراصل آپ کے...... کون ہیں آپ اور کیا ہوا میرے ابّو کو، کہاں ہیں وہ؟اس سے پہلے کہ شاد کچھ کہتا وہ ایک دم سے بول پڑی۔دیکھیے وہ عافیت سے ہیں اور میرے گھر پر ہیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مجھ پر بھروسہ کیجیے میں آپ کو لینے آیا ہوں، یہ بابا کا حکم ہے۔تھوڑی دیر تک تجسس اور حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ جانے کے لیے راضی ہوئی۔پھر دونوں ایک ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟ خاموشی کو توڑنے کے

”مٹی کے اس مکان کی حالت خاصی خستہ تھی، چہار دیواری کے نام پر ٹوٹی پھوٹی دیواریں بس کسی طرح ٹکی ہوئی تھیں، جبکہ اس کے آس پاس کے مکانات کوٹھی نما تھے، جنھیں دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ یہ مکان بھی اسی محلے کا حصہ ہے۔یہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ایک کمزور دروازہ جو بند تھا،،

لیے شاد نے جان بوجھ کر اس سے یہ سوال کیا تھا؟ بشریٰ...... بہت ہی نحیف آواز سے اس نے کہا، پھر بولی۔۔۔۔میں سمجھ رہی تھی کے آپ میرے نام سے واقف ہوں گے...... کیا ابو نے نہیں بتایا؟ دراصل ہمیں طویل گفتگو کا موقع نہیں ملا، حالات ہی ایسے تھے کہ دوسرے موضوع پر بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا، ویسے بابا بہت اچھے انسان ہیں، شاد نے اس کی دلجوئی کی خاطر یہ جملہ کہا۔کاش! وہ اپنوں کی نگاہ میں بھی اچھے ہوتے تو ہمیں آج یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا۔دنیا کی نظر تو دور کی بات ہے، اپنے اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، دولت ہتھیانے کے لیے وہ جان کے دشمن بن جاتے ہیں اور کوئی خوددار ان حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا حشر ہماری طرح ہوجاتا ہے۔یہاں انسان اور انسانیت کی حیثیت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے جناب۔بشریٰ نے گاڑی کے شیشے کے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ڈرائیور گاڑی یہیں روک دو...... آپ اندر تشریف لے چلیں......شاد نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کرتے ہوئے بشریٰ کو مخاطب کیا۔بابا سو رہے تھے اس لیے وہ بشریٰ کو بابا کے پاس بٹھا کر خود مطبخ کی طرف بڑھ گیا۔جب شاد کچن سے فارغ ہو کر باہر آیا تو باپ اور بیٹی محو گفتگو تھے، اس لیے وہ بھی ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔کیسے ہیں بابا؟ دراصل آپ سو رہے تھے اس لیے ہم نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔اور جب آئے تو شام ہو رہی تھی اس لیے میں...... دیر سے آنے پر اس نے وضاحت کی۔کوئی بات نہیں بیٹا، میں تمھاری مجبوری سے اچھی طرح واقف ہوں، ہمارا گھر تلاش کرنے میں تمھیں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟ اپنوں کو تلاش کرنے میں دشواری کیسی بابا، یہ تو آپ کا حکم تھا؟ اس درمیان بشریٰ چپی سادھے بیٹھی تھی اس لیے وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔اندر باتھ روم ہے آپ فریش ہولیں...... میں بابا کے لیے گرم پانی لاتا ہوں۔پھر شاد نے

گرم پانی سے پہلے بابا کے چہرے کو صاف کیا اور اپنے ہاتھوں سے انھیں دوا کھلائی۔ یہ دیکھ کر بشریٰ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، مگر اس نے حالات کے پیش نظر خود پر قابو رکھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات آ جا رہے تھے۔ شاد کی یہ مہربانیاں بھی اس کی سمجھ سے پرے تھی، اس نے جب سے ہوش سنبھالا، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے انھیں انسان سمجھنے کی کوشش کی تھیں۔ پھر اس نے اس بات پر خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ابو پر اپنوں کی نگاہ نہیں پڑی ورنہ وہ لوگ تو ان کا قصہ تمام کر کے ہی ٹھنڈی سانس لیتے۔ خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے، دل ہی دل میں اس نے شاد کی ممنونیت کا بھی اظہار کیا، وہ اس کی شخصیت سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ ابھی وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے زور زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے توڑ کر ہی دم لے گا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، اتنی رات میں شاد کے کسی رشتہ دار کے یہاں آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔۔۔ دوسری طرف بشریٰ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ نامعلوم خدشات نے اسے پھر سے پریشان کرنا شروع کر دیا، وہ کانپنے لگی، بابا کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا، اور دروازے کو پیٹنے کا سلسلہ جاری تھا۔ شاد نے بشریٰ اور بابا کی طرف دیکھا اور پھر انھیں تسلی دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ہو رہی ہلچل سے محسوس ہو رہا تھا کہ کئی لوگ ہیں، پھر بھی ہر طرح کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر شاد نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ باہر کا منظر اتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ کئی لوگ مسلح تھے اور ان کے آؤ بھاؤ سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ پھر بھی شاد نے ہمت کر کے پوچھا۔ کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے آپ لوگوں کو؟ ہم کون ہیں یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ بتاؤ کہ لونڈیا اور بڈھے کو کدھر چھپا کر رکھا ہے تم نے؟ ایک ادھیڑ عمر شخص جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اس نے کرخت لہجے میں پوچھا، آج سالے کا کام ہی تمام کر دوں گا، ناک میں دم کر رکھا ہے اس باپ اور بیٹی نے۔ بشریٰ اور بابا نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا، یہ بابا کے چچیرے بھائی چودھری سلطان تھے جن کی نگاہ ان کی ساری جائداد پر تھی اور اس پر قبضہ کرنے کی اس نے کئی بار کوشش کی تھی، مگر اب تک ناکام رہے تھے۔ آج جب اسے پتہ چلا کہ بابا کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور کوئی اسے پناہ دیے ہوئے ہے تو وہ اپنے چند غنڈوں کے ساتھ شاد کے یہاں دھمک پڑے تھے۔ بابا نے یہ سوچ کر کہ کہیں یہ لوگ شاد پر حملہ نہ کر دیں، اٹھنے کی کوشش کی، مگر بشریٰ نے انھیں روک دیا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

باپ بیٹی چپ چاپ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سنتے رہے اور ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تکتے رہے۔۔۔ یا اللہ! دل ہی دل میں انھوں نے رب کائنات کو پکارا۔ تو ہی سب کا محافظ اور پالن ہار ہے۔ بس ہم بے سہاروں کی لاج رکھ لے۔۔۔ ادھر شاد! چودھری سلطان سے کہہ رہا تھا کہ آپ لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، جن لوگوں کی آپ کو تلاش ہے انھیں میں نہیں جانتا۔۔۔ بھلا میں انھیں اپنے گھر لا کر مصیبت کو دعوت کیوں دوں۔۔۔ کون باپ؟ کون بیٹی؟ میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔۔۔ نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو، ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ دونوں یہیں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ سلطان کے چھوٹے بھائی ارمان کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم ہمیں نہیں جانتے، پورا علاقہ ہم سے خوف کھاتا ہے، اگر تم نے 'باپ بیٹی' کو ہمارے حوالے نہیں کیا، تو اس کا انجام تم سوچ بھی نہیں سکتے، یہ بہت خطرناک معاملہ ہے، ہمیں ہر قیمت پر وہ دونوں چاہیے۔ دیکھیے جناب! آپ جو کوئی بھی ہیں، اس سے ہمیں کوئی لینا دینا نہیں۔ اچھی بات ہے کہ آپ لوگ اپنوں کو تلاش رہے ہیں، مگر جس نے یہاں کا پتہ دیا ہے وہ آپ لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے جھوٹی اطلاع دے کر۔۔۔ کہیں اور تلاش کیجیے۔۔۔ غلط جگہ پر آپ نے دروازہ کھٹکھٹا دیا ہے۔ یہ رہا میرا شناختی کارڈ اور اس وقت گھر کے اندر میری شریک حیات اور سسر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ مجھے آپ لوگ سمجھدار لگتے ہیں، اس سے پہلے کہ میں کوئی اور قدم اٹھاؤں یہاں سے باعزت چلے جائیں تو بہتر ہے۔ معاف کیجیے گا سر! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ آپ کا گھر ہے۔۔۔ سالے جمن کی خیر نہیں اس نے ہی ہمیں یہ غلط اطلاع دی ہے، ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں اتنی رات کو تکلیف دینے کے لیے۔۔۔ سی آئی ڈی افسر کا کارڈ دیکھتے ہی ان لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا، ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے تیز تیز قدموں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

جبکہ بشریٰ شاد کی یہ بات سن کر ایک دم سکتے میں آ گئی اور بابا کا چہرہ کھل اٹھا، اس بڑی آفت کے ٹلنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ انھیں معلوم تھا کے شاد اپنے فیصلہ پر عمل کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔

Dr. Shahabuddin Saqib
S-8/25 Safina Road Jogabai Ext
Near Al Taqwa Masjid,Jamia Nagar
Okhla, New Delhi-110025

آدھے ادھورے

نصرت شمسی

میں دس سال سے اس بدنام سڑک سے گزر کر کالج آ جا رہی تھی۔ یہ بدنام سڑک میرے راستے کی ضرورت تھی اور ان عورتوں کا ٹھکانہ بھی جنھیں ہمارے سماج میں طوائف کہا جاتا ہے۔ ہر شریف النفس اس سڑک سے جھکی گردن اور نیچی نگاہوں سے گزر جاتا لیکن وہ جھکی جھکی نگاہوں سے ان نیم برہنہ عورتوں کو ضرور دیکھ لیتا جن جھکی نگاہوں سے میں انھیں دیکھ لیا کرتی۔ یہ لمبی سڑک ان بدنام عورتوں کی جائے پناہ تھی۔ نیچے پورا بازار چلتا اور اوپر ان آدھی ادھوری عورتوں کی زندگی۔ مجھے نہ جانے کیوں ان عورتوں سے نفرت کبھی محسوس نہ ہوئی۔ ایسا کیوں تھا یہ تو مجھے خود پتہ نہیں ہاں مگر اپنا یہ خیال میں کبھی کسی سے بانٹ بھی نہ سکی۔ مردوں کے لیے تو یہ ٹائم پاس بازار تھا، ہر اس مرد کے لیے جو اوپر چڑھ سکتا تھا اور اس کے لیے بھی جو چڑھ نہیں سکتا تھا۔ جیسے کوئی چائنیز مال ہو۔ پیسے دے کر خریدا استعمال کیا اور پھینک دیا۔ آدھی برہنہ عورتیں جو دن بھر اپنے جنگلوں کھڑکیوں پر لٹکی رہتیں اور عجیب عجیب آوازیں اور اشارے گزرنے والوں کے لیے مکمل مقناطیسیت کا کام کرتے، ان کے سجے سجائے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگانا بالکل بھی مشکل نہ تھا کہ ان کا معیار زندگی کیا ہے؟ سستے پاؤڈر اور لپ اسٹک سے خود کو پوت پوت کر انھوں نے اپنے اچھے بھلے چہروں کو بھی برباد کر لیا تھا مگر یہی ان سب کا سب سے بڑا ہتھیار بھی تھا۔

کبھی کبھی میں اپنے شوہر سے ان کی زندگی کے بارے میں باتیں کرتی اور اظہار ہمدردی بھی کرنے کی کوشش کرتی تو ہر بار وہ مجھے ڈانٹ کر میرا منھ بند کر دیتے اور میں حوصلہ شکن ہو کر چپ ہو جاتی لیکن اپنے اندر کے جوار بھاٹا کو کبھی دبا نہ سکی۔ ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی تمنا ہر حوصلہ شکنی سے مزید بڑھ جاتی اور اسی بڑھتے ہوئے لاوے نے ایک دن میرے قدم اس طرف بڑھوا دیے۔

کبھی کبھی میں اپنے شوہر سے ان کی زندگی کے بارے میں باتیں کرتی اور اظہار ہمدردی بھی کرنے کی کوشش کرتی تو ہر بار وہ مجھے ڈانٹ کر میرا منہ بند کردیتے اور میں حوصلہ شکن ہو کر چپ ہو جاتی لیکن اپنے اندر کے جوار بھاٹا کو کبھی دبا نہ سکی۔ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی تمنا ہر حوصلہ شکنی سے مزید بڑھ جاتی اور اسی بڑھے ہوئے لاوے نے ایک دن میرے قدم اس طرف بڑھوا دیے۔

کئی دن خود سے جنگ کرنے کے بعد آخر ایک دن میں نے ارادہ کر ہی لیا کہ آج میں ان سے ملاقات ضرور کروں گی اور اپنے اندر کی خلش کو دور کرنے کی پوری کوشش بھی لیکن سوال یہ تھا کہ جاؤں تو کس کوٹھے پر؟ یہ

سوال بہت خطرناک تھا اور کہیں نہ کہیں میرے اندر بہت سا خوف بھی پیدا کر دیتا۔ میں جس معاشرے میں رہتی تھی اس کا کوئی شخص اس دنیا میں جانے کا سوچتا، تو بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا پھر میں......

''کل میں کالج جاتے ہوئے اپنا پورا منہ اٹھا کر ان سب کو دیکھوں گی پھر فیصلہ کروں گی۔'' میں نے خود کلامی کی۔

اگلے دن میں نے اپنا پورا منہ اٹھا کر شروع سے آخیر تک ان سب کو دیکھا۔ کالج پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے جانا کہاں ہے۔ کالج سے میں ایک گھنٹہ قبل اٹھی اور بڑا سا نقاب لگا کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔ دل کی حالت بہت عجیب تھی اور اگر کسی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا؟ کا سوال بے چین کیے ہوئے تھا۔ کچھ بھی ہو معاشرے کا ڈر اکثر ہمیں جینے نہیں دیتا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے کس کوٹھے پر جانا ہے، میں نے بہت سے دم درود خود پر کیے اور ایک زینے پر قدم رکھ دیا۔ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے اور دل کی دھڑکنیں مزید تیز ہو گئی تھیں، نقاب سے میرا پورا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ زینہ نہایت تاریک اور بوسیدہ تھا۔ سیلن کی بدبو میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ پندرہ سولہ سیڑھیاں چڑھ کر میں جس جگہ کھڑی تھی وہ ایک دالان سا تھا۔ جس کی ایک دیوار جو سڑک کی طرف کھلتی تھی آدھی تھی اور اس پر جالیاں لگی ہوئی تھیں جس سے یہ لوگ دن بھر نیچے جھانک کر اپنا دن گزارا کرتی تھیں۔ میں چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ میں نے نظریں گھما کر دروازے کو دیکھا۔ دروازہ تو نظر نہیں آیا صرف چوکھٹ نصب تھی۔ دروازہ جو شاید کبھی لگا ہی نہیں تھا۔ سامنے ایک کمرہ تھا اور اس کے برابر ایک باورچی خانے جیسا کچھ تھا۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ میری نظر گھوم کر ایک اور کمرے کی طرف گئی جو میری بغل میں ہی تھا۔ وہ بہت صاف ستھرا اور سجا سجایا سا تھا۔ دالان کے ایک کونے میں ایک چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت لیٹی پنکھا جھل رہی تھی۔ زینے میں آنے والی بسیند اوپر آتے آتے اور بڑھ گئی تھی۔ اب مجھے اس بو پر شک ہونے لگا تھا۔ ابھی میں جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ایک جوان عورت کمرے سے باہر آئی اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جو مجھے دیکھ کر گر گیا۔

''کون ہو تم؟'' کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''میں...... میں۔''

''یہ میں میں کیا لگا رکھی ہے۔ نقاب ہٹاؤ اور بتاؤ یہاں کیوں آئی ہو؟''

میں نے جلدی سے اپنے چہرے سے نقاب نوچ لی۔

''میں سعدیہ ہوں...... اور آپ سے ایک ملاقات کرنے آئی ہوں۔''

''ملاقات......؟'' استفہامیہ لہجہ۔

''ہم سے تو آج تک شریف زادے ہی ملنے آتے ہیں۔ یہ شریف زادی؟ آؤ اندر آؤ۔''

میں جلدی سے اس کے قریب ہو گئی۔

''جی اگر آپ کی اجازت ہو تو میں چند منٹ آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ معذرت خواہ ہوں دروازہ بجا کر اندر آنا چاہتی تھی مگر دروازہ کہیں......''

''...... نظر نہیں آیا۔ دروازہ اور کوٹھوں پر؟ ہمیں کس کا ڈر؟ یہاں تو چور بھی اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ خیر بیٹھو اور کہو کیا بات ہے؟ کیا مصیبت زدہ ہو؟ پناہ چاہتی ہو؟''

''نہیں...... نہیں'' میرے اندر ایک خوف اتر گیا۔ میں بس آپ سے ایک ملاقات......''

''بیٹھو......'' بالکل سرد لہجہ۔

میں بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی کہ اس نے ایک کرسی گھسیٹ کر میرے آگے کر دی اور میں جلدی سے اس پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے ہم دونوں کے درمیان خاموشی ہی گزر گئے۔ پھر میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی ہمت کر کے لب کھولے۔

''جی...... دراصل...... میں...... میں آپ لوگوں کی دنیا کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ لوگ کیسے......''

''...... طوائفیں کیسے بنتی ہیں بی بی یہ جاننا چاہتی ہو؟'' تمسخرانہ لہجہ میں ہکا بکا رہ گئی۔ جس سوچ کو میں خوبصورت الفاظ میں لپیٹ کر پیش کرنے سے قاصر تھی اس نے ایک جملے میں میری سوچ کو پڑھ لیا تھا۔

''جی...... بات...... دراصل برا مت مانیے گا لیکن یہ تو آپ کو بھی علم ہے کہ سوسائٹی اس طبقے کو وہ حق نہیں دیتی جو دیگر سماج کے لوگوں کو ہے۔''

میری بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پانچ، پانچ سال کے دو بچے لڑتے دوڑتے بھاگتے اس عورت کے پاس آ گئے اور ان بچوں کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ کوٹھوں پر بچے؟

مجھے بیٹھے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر میں نے دیکھا کہ سڑک کی طرف کھلنے والے جنگلے پر دو جوان خوبصورت لڑکیاں اپنے اشاروں کنایوں میں مصروف تھیں۔ انھوں نے میری آمد پر صرف ایک بار مجھے حیرت سے دیکھا تھا پھر جھک کر سڑک کے نظاروں میں کھو گئیں۔

میں نے ہمت کر کے بچوں کی طرف دیکھا۔ اس نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی میری نظروں کو پڑھ لیا۔

''دیکھ رہی ہیں یہ بچے؟ کوٹھے والیوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں کیا؟''

استہزائیہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''دیکھیے کتنے شریف ہیں اس مکمل معاشرے کے شریف النفس لوگ۔اپنے بچوں کو بھی اس غلیظ دنیا میں چھوڑے بیٹھے ہیں۔روکھی سوکھی کھانے پر مجبور کر رہے ہیں۔اپنے مکمل وجود کے ان ٹکڑوں کو نامکمل بنانے کے لیے چھوڑ دیا۔ان کے باپ کے پاس بہت پیسہ اور بڑا رتبہ ہے ان کے گھر کے بچے گاڑیوں میں بیٹھ کر اسکول جاتے ہیں اور یہ بدنصیب......انھیں تو سرکاری اسکول بھی نصیب نہیں۔داخلہ کرایا تھا مگر وہاں بھی پڑھنے نہیں دیا سماج کے لوگوں نے،انھیں لوگوں نے جو بند کمروں میں ہمارے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ہم پر روپیہ لٹا کر چلے جاتے ہیں۔دن میں اپنی سفید پوشی کا بھرم اس طرح رکھتے ہیں کہ چند دنوں میں ہی طوائف کی اولاد کہہ کر نکال باہر کرا دیا۔یہ معصوم اپنی حسرتیں اور کتابیں لے کر بدنامی کا ٹیکہ ماتھے پر سجائے اسی جائے پناہ پر واپس آ گئے۔لوگوں کی باتوں کے پتھر انھیں کہیں کچھ کرنے نہیں دیتے۔بتائیے کیا بنیں گے یہ؟ کیا دے پائیں گے سوسائٹی کو؟ انسانیت کو؟ کیا رہ جائے گا ان کے اختیار میں؟ کیسے کمائیں گے یہ رزق حلال؟ کیسے سوچیں گے اچھی سوچ؟ یہ کوٹھے یوں ہی آباد ہوتے رہیں گے کیونکہ ان کے آباد کرنے والے انھیں کوٹھوں پر پل کر جوان ہوتے ہیں۔

''انھیں دیکھ رہی ہیں آپ......؟''

اس نے چارپائی پر لیٹی معذور بیمار لاغر عورت کی طرف اشارہ کیا۔

''پوری جوانی لوگوں کا دل بہلاتی رہیں۔مشہور رقاصہ جن کے ایک ایک گھنگرو کی کھنک پر لوگ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے۔انھوں نے بتایا تھا کہ کسی نے انھیں یہاں بیچ دیا تھا۔یہ اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔نہ جانے کیسے ان کے والدین کو خبر لگ گئی کہ ان کی بیٹی یہاں ہے۔ان کی استانی نے رحم کھایا اور کہا کہ بچی کو پہچان کر لے جاؤ مگر جانتی ہیں آپ کیا ہوا؟ ان کے والدین نے معاشرے میں بنی اپنی جھوٹی شان کی خاطر انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔کیسے سامنا کرتے وہ لوگوں کا کہ ان کی بیٹی چھ دن سے کوٹھے پر تھی۔کیا راستہ بچا تھا ان کے پاس،پاؤں میں گھنگرو باندھنے کے سوا؟ بی بی کوئی ہمارے لیے نہیں سوچتا۔سب یہی کہتے ہیں ہاں ہم گندے ہیں،کیونکہ معاشرے کی ساری گندگی ہم ہی سمیٹ کر رکھتے ہیں۔بے چاری نے پھر جو گھنگرو باندھے تو تاحیات ناچتی رہیں اور اب ان کے علاج کے لالے ہیں۔پھوٹی کوڑی نہیں ان کے پاس جو اپنے لیے کچھ کر سکیں۔موت کے انتظار میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔مر کر بھی کہاں چین؟ ہمارے تو جنازے تک اٹھانے والا کوئی نہیں۔وہ بھی خود ہی ڈھونے پڑتے ہیں۔''

''اسے دیکھ رہی ہیں آپ؟''

اس نے چھجے پر لٹکی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''بی۔اے پاس ہے۔گاؤں کے لڑکوں نے اغوا کر کے اس کی زندگی برباد کر دی۔ایک ہفتہ بعد کسی ہسپتال میں ملی۔گھر والوں نے منہ پھیر لیا کہ اب تو ہمارے کسی کام کی نہیں۔تڑپی،پھڑکی،روئی،چلائی پھر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔اپنے زخموں کو بھر کر کھڑی ہوئی،نوکری تلاش کی لیکن جہاں جاتی بدبختی ساتھ چلی جاتی۔چند دن میں ہی یہ کہہ کر نکال دیا جاتا کہ یہ شریف لوگوں کے کام کرنے کی جگہ ہے۔کئی جگہ باس نے اپنی شرافت کا مظاہرہ کرنا چاہا جس پر اس نے لات مار دی۔خاک چھانتی پھری،چھالے پڑ گئے کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔لہولہان تھے اس کے پیر جب اس نے یہاں قدم رکھا۔رات کے تین بجے تھے جب یہ میری سیڑھیوں پر پڑی ملی۔کیا قصور تھا اس کا؟ کیسے ماں باپ تھے جنھوں نے جھوٹی شان کی خاطر اپنی اولاد کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔جان چھڑانے کو صرف ایک جملہ کہ''مر گئی تو ہمارے لیے۔''کون مرتا ہے اس طرح؟ اس کے اپنوں نے ہی دربدر کرنے کو چھوڑ دیا۔ویسے بھی اب ایم۔اے بی۔اے والوں کو نوکریاں کہاں؟ کیسے جیتی اپنی زندگی؟ ایسے ہی بے سہاروں کا سہارا بن جاتے ہیں یہ کوٹھے۔گھر کی حالت دیکھ رہی ہیں آپ؟ دال روٹی بڑی مشکل سے چلتی ہے۔گھر کو کیا سدھاریں،بس ایک کاروباری کمرہ ہے جسے دلہن کی طرح سجا کر رکھنا پڑتا ہے۔''

اس نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہاں راجہ اور رنک سب بے جھجک آتے ہیں اور......بی بی ہم تو ہمیشہ سے آدھے ادھورے تھے اور رہیں گے۔لوگ اپنے ٹوٹے،بکھرے وجود لے کر یہاں آتے ہیں خود کو سمیٹ کر مکمل کر کے ہمیں بکھیر کر چلے جاتے ہیں اور سوغات میں دے جاتے ہیں نامکمل وجود......کیا کبھی کسی نے سوچا ہے کہ معاشرے کو طوائفوں کے اڈے کون دیتا ہے۔''

اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا اور میں شرمندہ شرمندہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

□□□

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur-244901 (UP)

نیکی کا صلہ

سعدیہ راشد

مومنہ نے اسکول سے واپسی پر جب گھر میں قدم رکھا تو سامنے صحن میں تخت پر امی جان بیٹھی نظر آئیں جو اور دنوں سے کچھ زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں اور ان کے چہرے کی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی مومنہ نے سوچا ضرور کوئی خاص بات ہوئی ہے۔

'السلام علیکم امی جان!' مومنہ سلام کرتے ہوئے اندر آ گئی اور برقعے کے بٹن کھولنے لگی۔

وعلیکم السلام میری بچی!' خوش رہو امی جان مزید خوش ہو کر اسے ڈھیر ساری دعائیں دینے لگیں۔ کیا بات ہے؟ مومنہ نے پوچھا

نسیم نے کہلوایا ہے کہ لڑکے والے آ رہے ہیں شام کو۔ باجی کو دیکھنے۔

'ہاں بس اللہ کرے رشتہ طے ہو جائے۔ مجھے تو وہ لڑکا بہت پسند ہے۔

اللہ بہتر کرے! مومنہ نے اپنے دل میں خوشی محسوس کی کتنا اچھا ہو جائے کہ باجی کا رشتہ کہیں طے ہو جائے اور وہ اپنے گھر خوش آباد رہے تو اماں کو بھی کتنی بے فکری ہو جائے لیکن پھر بھی ہم دونوں چھوٹی بہنوں کی ذمہ داری تو باقی رہے گی۔ بس اللہ تعالیٰ ہی ان ذمہ داریوں کو پورا کروائے گا۔

کوئی تیاری کرنی ہے امی جان؟

گھر کو تھوڑا صاف ستھرا کرنا ہے اور کچھ ناشتے وغیرہ کا سامان آ جائے گا اور کیا تیاری کرنا ہے۔ امی نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ باجی کچن میں بیٹھی کچھ کام کر رہی تھیں۔ کون آ رہا ہے؟ امی کون آ رہا ہے مومنہ نے انھیں چھیڑا تو وہ مسکراہٹ نہ چھپا سکیں چل ہٹ یہاں سے مجھے کیا پتا کون آ رہا ہے؟ اللہ کرے وہ بہت اچھے سے ہوں۔ اگر اچھے ہوں تبھی یہ شادی ہو ورنہ نہ ہو۔ مومنہ نے محبت سے کہا۔

'کہتی تو ٹھیک ہے تو!' باجی کے سانولے چہرے پر بڑا نور پھیلا ہوا تھا مومنہ سوچنے لگی باجی نے آٹھویں کلاس سے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تھا انھیں پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی یہاں تک بھی بڑی مشکل سے پہنچی تھیں۔ گھر کے کام کاج میں ان کا بڑا دل لگتا تھا شکل صورت بھی واجبی تھی اس لیے امی جان کو ان کی بڑی فکر رہتی اور امی بلکہ گھر کے بھی لوگ چاہتے تھے کہ ان کا رشتہ طے ہو جائے اور وہ اپنے گھر کی ہو جائیں۔ ان کے برعکس مومنہ کے دل میں علم حاصل کرنے کی لگن تھی وہ گریجویشن کرنے کے بعد ایک اسکول میں ملازمت کرنے لگی تھی تاکہ گھر کے خراب حالات کو تھوڑا سا سنوار سکے اس کے والد کی تنخواہ نہایت قلیل تھی اور سات بہن بھائی اور ابھی بہت ہی چھوٹے تھے۔ دونوں بڑے بھائی تو الگ ہی مزاج کے تھے بس ہر وقت اماں جان سے جھگڑتے۔ امی جان سے برا بھلا سنتے اور سارا دن آوارہ گردی کرتے پھرتے۔ ایسے میں مومنہ کا دل چاہتا کہ وہ اپنے سیدھے سادھے اور خاموش طبع ابا جان کا سہارا بن جائے ان کا ہاتھ بٹائے اور یوں اس ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی آگے کی پڑھائی بھی کر لی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ بہت عرصے تک اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہ سوچے گی بلکہ باجی کی شادی ہو گی۔ پھر بھائیوں کی شادی ہو گی پھر چھوٹی بہن شمسہ کی شادی کروں گی پھر کہیں کوئی ایسا سلسلہ ہو تو مناسب بھی ہے۔

مگر ہوا یوں کہ لڑکے والوں نے اسی شام کہہ دیا کہ ہمیں تو مومنہ پسند آئی ہے اگر آپ لوگ اس کا رشتہ کر دیں تو عید کے چاند میں شادی ہو جائے۔

"اس نے گھر پر ایک نظر ڈالی۔ کونے میں رکھا ڈبل ڈور فرج ، کلر ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر ، مسہری، صوفے ، الماریاں، سارا گھر بھرا ہوا تھا، آباد تھا۔ ایک اس کا دل بس ویران رہ گیا ۔امی جان آرام سے تخت پر بیٹھی پان کھا رہی تھیں بھائی کے بچے علیم اور کلیم صحن میں بیٹھے کھیل رہے تھے اور وہ بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ یہ ماحول کس قدر یکساں ہے غیر تبدیل شدہ......"

'بھئی وہ تو سہانا کے بعد ہے پہلے ہمیں اس کی بڑی بہن کی شادی کرنی ہے' امی نے جواب دیا۔

اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے چھوٹی ہو یا بڑی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپ کو تو دونوں ہی لڑکیوں کی شادی کرنی ہے بس آپ ہاں کر دیں!'

'ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے—دیکھیں—اچھا میں اس کے ابا جان سے بات کروں گی امی نے انھیں ٹالا۔

اور یہ جان کر مومنہ کو ان عورتوں پر غصہ آ گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہے اتنے لمبے چوڑے پروگرام ہیں میں اور بھی شادی کروں؟ ہونہہ!!

سہانا کے کا چہرہ اتر گیا۔ امی جان بھی اداس ہو گئیں ابا جان نے ہمت بندھائی۔

'کوئی بات نہیں تم انھیں منع کر دینا یہ رشتے ناطے تو سب تقدیر سے ہوتے ہیں۔ نہیں تھا یہ سہانا کے مقدر میں اور کہیں طے ہو جائے گی بات! فکر نہ کرو۔

مگر فکر تو سبھی کی جان کو لگ گئی تھی کیونکہ اب بار بار یہ ہوتا کہ رشتے آتے اور بڑی بہن کے بجائے منجھلی بیٹی مومنہ کو پسند کر جاتے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ پہلے سہانا کی شادی کا نمبر تھا۔ بھلا پہلے مومنہ کس طرح بیاہ دی جاتی؟ جبکہ مومنہ ملازمت کے ذریعے تھوڑا بہت سہارا بھی دے رہی تھی اور وہ خود شادی کے ذکر سے کوسوں دور بھاگتی تھی اس صورت حال کا ذکر امی جان نے اپنی دو چار قریبی سہیلیوں اور پڑوسیوں سے کیا تو ان میں سے کچھ نے مشورہ دیا کہ اب جو بھی رشتہ آئے تو تم مومنہ کو سامنے نہ کرنا بلکہ صرف سہانا کو دکھانا۔ کچھ نے یہ بھی کہا کہ جس کا مقدر کھل رہا ہے تم اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔ تمھیں تو جلد یا دیر دونوں ہی لڑکیوں کو رخصت کرنا ہے۔

'نہیں ...... پہلے سہانا کی شادی ہو۔ اس کے بعد میں مومنہ کو رخصت کروں گی ......اور پھر یہ کہ مومنہ شکل صورت میں اچھی ہے اسے بھلا رشتوں کی کوئی کمی ہو گی۔ امی جان نے فخریہ کہا۔ مومنہ ناک نقشے میں سہانا سے کہیں بہتر تھی اور رنگت بھی صاف تھی۔ پڑوسن خالہ ہاجرہ نے کہا: 'ایک بات کہے دیتی ہوں بہن رشتے بھی مقدر ہی سے آتے ہیں ان کا بھی ایک وقت ہوتا ہے جب لڑکی کی عمر پکی ہو جاتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ میری مانو تو جس کے اتنے رشتے آ رہے ہیں اس پر ظلم نہ کرو۔ کسی اچھی جگہ دیکھ کر بات پکی کر دو! ایسا نہ ہو کمائی اور پڑھائی کے چکر میں عمر اتنی ہو جائے کہ بعد میں اچھے رشتوں کو بھی ترسو!' ان کی بات سن کر امی جان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

'ارے ہٹو بھی چھوٹی کا کر دوں اور بڑی گھر میں بیٹھی رہ جائے۔ یہ مجھے منظور نہیں...... بعد میں ہر کوئی کہے گا کہ بڑی بیٹی کا رشتہ کیوں نہ ہوا۔ کیا عیب تھا جو یہ بیٹھی رہ گئی...... بعد میں اسے کوئی نہیں پوچھے گا پھر میں کیا کروں گی......؟ کہاں زبردستی دھکا دوں گی اسے؟

'میں نے تو اپنے دل کی بات کہہ دی تم سے...... آگے تمھاری مرضی! خالہ ہاجرہ نے کہا۔

کافی دن گزر گئے کہیں سے کوئی پیام نہ آیا پھر سنا کہ ابا جان کے ساتھ کام کرنے والے منصور چاچا نے اپنے بیٹے کے لیے بات کی ہے اور وہ دو چار روز میں ان کے گھر آئیں گے گھر میں پھر ایک بار خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امی جان نے پہلے ہی مومنہ سے کہہ دیا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی جائے۔ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی وجہ سے باجی کے رشتے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کا سامنے نہ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ سامنے نہ گئی مگر پھر بھی ان کا وہاں رشتہ طے نہ ہوا۔ گھر میں ایک عجیب سی اداسی چھا گئی۔ انھی دنوں اچانک بڑے بھائی نے کسی لڑکی سے شادی کر لی اور ایک دن دلہن کو گھر لے آئے۔ امی جان کا غصہ سے برا حال ہو گیا۔ ابا جان کو بھی بہت ناگوار گزرا۔

'اتنی جلدی تھی تمھیں اپنا گھر بسانے کی؟' امی جان نے کہا۔

کچھ دنوں تک گھر کا ماحول بہت گرم رہا لیکن پھر وقت کے ساتھ سب نے بہو کو قبول کر لیا۔ سنبلہ نے بھی اپنے حسن اخلاق سے سب کے دلوں میں جگہ بنالی۔ اور کچھ دن بعد باجی کی شادی کا مرحلہ بھی طے پا گیا اور وہ بھی اپنے گھر رخصت ہو گئیں سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

زندگی اپنے روٹین پر چلتی رہی مومنہ اپنی ملازمت کرتی رہی اس کی تنخواہ سے گھر کی حالت کافی سدھر گئی تھی اسی بیچ اس کے کئی پیام آئے

امی نے اس سے ذکر کیا مگر اس کے انکار پر وہ مطمئن ہو گئیں۔ مہینہ کی تنخواہ کا کافی حصہ وہ امی کو ہی دیتی تھی اس کے بعد بھی چھوٹے بھائی بہن کی کتاب کاپیوں کی ذمہ داری، ابا جان کی دوا وغیرہ اور جہاں ضرورت پیش آتی مومنہ آگے بڑھ کر جو کچھ اس کے پاس ہوتا پیش کر دیتی۔

”اس کے سارے وجود میں جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے۔ امی سے پوچھے کہ آپ کو واقعی میرے لیے رشتہ چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو بیسیوں اچھے رشتے آنکھیں بند کر کے کیوں لوٹا دیے۔ بڑی بیٹی کے بعد سب سے چھوٹی بیٹی بھی رخصت ہو گئی۔ آپ کو میرا خیال کبھی نہ آیا۔ کیا مجھے ہمیشہ بیس بائیس سال کا ہی رہنا تھا“

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ لوگ الگ گھر میں رہتے تھے۔ ادھر ابا جان بھی ریٹائر ہو گئے تھے گھر کی ساری ذمہ داری مومنہ کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔ چھوٹی بہن کی شادی بھی ہو گئی۔ اکثر بھائی اور سنبلہ آتی رہتی تھیں۔ مومنہ اکثر سنبلہ کو دیکھ کر سوچتی اس کا مقدر کتنا اچھا ہے کتنے آرام و سکون سے رہ رہی ہے۔ نہ نوکری کی مصیبت پالی اور نہ دفتروں میں عمر گنوائی۔

اس نے گھر پر ایک نظر ڈالی۔ کونے میں رکھا ڈبل ڈور فرج، کلر ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر، مسہری، صوفے، الماریاں، سارا گھر بھرا ہوا تھا، آباد تھا۔ ایک اس کا دل بس ویران رہ گیا۔ امی جان آرام سے تخت پر بیٹھی پان کھا رہی تھیں بھائی کے بچے علیم اور کلیم صحن میں بیٹھے کھیل رہے تھے اور وہ بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ یہ ماحول کس قدر یکساں ہے غیر تبدیل شدہ...... اسی طرح...... میرے لیے کیا ساری زندگی بس ایک ساکت ماحول رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اب زندگی کے اس طرز سے بیزار ہو گئی ہوں تھک گئی ہوں...... یہاں کوئی نیا پن نہیں...... بتدیلی آئی ہے تو میرے وجود میں...... کہ اب بالوں میں جا بجا سفید بال نظر آنے لگے ہیں، چہرہ بھی تھکا ہوا اداس دکھائی دیتا ہے۔ شگفتگی اور تازگی جیسے غائب ہو گئی ہے۔ یا اللہ...... ایسا کیوں ہوا؟ سنبلہ کی شادی کو بھی اب سات سال ہو چکے تھے۔

بھابھی نے آج اس سے ذکر کیا کہ امی جان کہہ رہی تھی کہ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیں شاید اسی طریقے سے کوئی بات بن جائے۔‘

’ضرورت رشتہ کا اشتہار!‘ مومنہ زیر لب بڑبڑائی۔

’ارے اس طرح بھی اچھے رشتے مل جاتے ہیں آج کل تو اخبار ان اشتہاروں سے بھرے پڑے ہیں بھابھی نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس کے سارے وجود میں جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے۔ امی سے پوچھے کہ آپ کو واقعی میرے لیے رشتہ چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو بیسیوں اچھے رشتے آنکھیں بند کر کے کیوں لوٹا دیے۔ بڑی بیٹی کے بعد سب سے چھوٹی بیٹی بھی رخصت ہو گئی۔ آپ کو میرا خیال کبھی نہ آیا۔ کیا مجھے ہمیشہ بیس بائیس سال کا ہی رہنا تھا۔

وہ لڑکیاں جو نوکری کر کے خاندان کو سہارا دیتی ہیں۔ ان کو یہی صلہ ملنا چاہیے کہ جب ان کی شادی کی عمر ہو تو یہ کہہ کر رشتے لوٹا دیے جاتے ہیں کہ ابھی ہمیں اس کا بیاہ نہیں کرنا ہے اور جب گھر کی ضرورتیں جونک بن کر ان کی نوعمری اور تازگی کا رس چوس لیتی ہیں تب گھر والوں کو خیال آتا ہے کہ اب گھر سامان سے بھر گیا ہے۔ چلو اس کو رخصت کرنے کی تدبیریں کریں...... محلے والوں، رشتے داروں سے کہا جاتا ہے کہ ہماری لڑکی کی شادی کرا دو اور لوگ آ کر اس عمر رسیدہ عورت کو دیکھتے ہی انکار کر کے چلے جاتے ہیں تو کیسے کیسے کوڑے احساسات پر پڑتے ہیں کسی نے اس کا اندازہ کیا ہے؟ ہمیں کیوں میکے کی دہلیز پر روک کر لیا گیا؟ بتائیں امی جان......؟ اور اب آپ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دے کر مجھے مزید رسوا کر رہی ہیں...... کیا ابھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟ عورتیں آتی ہیں اور مجھے بڑی عمر کی ہونے کا طعنہ دے کر، میرا کلیجہ چھید کر چلی جاتی ہیں نہیں بننا مجھے تماشا...... نہیں چاہیے مجھے رشتہ...... نہیں کرنی مجھے شادی...... میری ذات جو ادھوری ہے اسے ایسا ہی رہنے دیں۔

...... جو تنہائی میرا مقدر بن گئی ہے...... میرے لیے وہی کافی ہے...... تھے کچھ خواب میرے بھی...... ٹوٹ گئے...... دم توڑ گئے...... اب نہ چھیڑیں اس قصے کو...... یہ خوشی میرا مقدر نہیں۔

تب ہی گرم گرم آنسوؤں کا ریلا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

Mrs. Sadia Rashid
W/o. Rashid Saleem Shamsi
R/o 6/97-6/72, Ghalib Pura Kalan
Near P.S. Nai Ki Modi
Subhash Park, M.G. Road
Agra-282010 (U.P)

تحریر

زبیدہ معین الدین

راضی

شاہ زیب کی صبا سے یہ چوتھی ملاقات تھی ہمیشہ کی طرح وہ کالج کیمپس میں صبا کا انتظار کررہا تھا۔

شاہ زیب اور صبا کی ملاقات ایک ماہ قبل کالج سیمینار میں ہوئی شاہ زیب ایک جانا مانا ڈاکٹر (Ph.d) ہے جو ایک کالج میں لیکچرر کی پوسٹ پر فائز ہے پہلی ہی ملاقات میں شاہ زیب صبا سے کافی متاثر ہوا اس کا انداز گفتگو اور صاف لہجے میں بات کرنا اسے بہت پسند آیا۔ صبا اسے بہت بولڈ اور کانفیڈ ینٹ لڑکی لگی۔

صبا لیکچر کے بعد کالج کیمپس پہنچی جہاں شاہ زیب اس کا انتظار کررہا تھا۔ صبا کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ شاہ زیب سونا بکھیرتی دھوپ کے سائے میں کھڑا تھا سورج کی کرنیں شاہ زیب کی بھوری آنکھوں کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔

''کیا مزاج ہیں ڈاکٹر صاحب!''

شاہ زیب مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہمارے مزاج تو درست ہیں، مگر ہم نے کال نہیں کی تو آپ بھی اس فرض سے سبکدوش ہوں بیٹھیں''۔

صبا آنکھیں بند کر کشادگی سے مسکرائی۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے، دراصل میں اپنی اسٹڈیز میں مصروف تھی جس کی وجہ سے وقت نہیں نکال پائی اور اس طرح شاہ زیب اور صبا کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ شاہ زیب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ شاہ زیب کی پیدائش کے چند سالوں بعد اس کے والد انتقال کر گئے شاہ زیب کی پرورش اس کی والدہ نے کی۔

کالج کے بعد صبا اپنے گھر پہنچی، صبا کا فیملی بیک گراؤنڈ بہت اچھا تھا وہ ایک مہذب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

''السلام علیکم بابا جان!''

''ارے آ گیا میرا بچہ۔''

''جی، آج کالج میں بھی بڑا مزہ آیا۔''

''بھئی ہم تو انتظار میں ہیں کہ کب آپ کی پڑھائی مکمل ہو۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں بابا جان۔''

''یہ بات آپ سے آپ کی امی جان کو کرنی چاہیے مگر یہ ذمہ انھوں نے ہمارے اوپر ڈال دیا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پرانے دوست رضا اپنے بیٹے زید سے آپ کا رشتہ لائے ہیں وہ ہمارے اچھے دوست ہیں اور زید ہمارا دیکھا بھالا بچہ ہے پھر بھی ہم چاہتے ہیں پہلے آپ کی رائے معلوم کی جائے پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔''

صبا نے ایک لمبی آہ لی۔

''ہمارے لیے یہ بہت بڑا فیصلہ ہے، صحیح ہوگا اگر آپ خود فیصلہ کریں، وحید صاحب صبا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ہمیں پورا اعتماد تھا کہ آپ ہمارے فیصلے پر راضی رہیں گی۔''

شاہ زیب اپنے کمرے میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا وہ آسمان میں

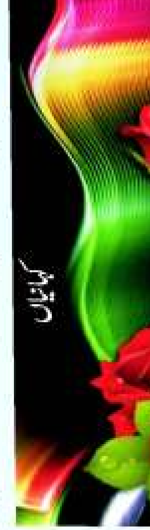

نظر آنے والے چاند کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ چاند بالکل صبا کے مشابہ ہے جو خود روشن ہے اور سارے جہان کو بھی روشن کر رہا ہے۔''

یکلخت آواز آئی، ''کیا بات ہے بیٹا، کھڑکی کے باہر کسے دیکھ کر مسکرا رہے ہو؟''

''کوئی نہیں امی بس صبا کی باتیں یاد آ گئیں۔''

شاہ زیب اپنے کالج کے کیبن میں بیٹھا کاموں میں مصروف تھا اچانک فون کی گھنٹی بجی اسکرین پر صبا نام چمک رہا تھا شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے فون اٹھایا۔

''کیا مزاج ہیں ڈاکٹر صاحب کے؟''

صبا کی شوخ آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

''جی بہتر ہے آپ سنائیں۔''

''کیا آج شام کی چائے آپ ہمارے ساتھ پینا پسند کریں گے؟''

''آپ نے تو ہماری خواہش کا خود ہی اظہار کر دیا۔''

''ٹھیک ہے پھر آج شام ملاقات ہوتی ہے۔''

شاہ زیب اپنے سارے کام مکمل کر چکا تھا بس اب اسے انتظار تھا صرف شام کا جو اپنی آمد کے ساتھ بہت سے خوشیاں اور نئی زندگی کی نوید سنائے گی۔

شام ہو گئی، شاہ زیب اور صبا ہوٹل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے صبا شاہ زیب کی باتیں سن کر بے نیازی سے ہنس پڑی۔

''آپ کی اور ہماری عمر میں 10 سال کا فرق ہے مگر آپ کی باتیں سن کر ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہمارے ہم عمر ہیں''۔

شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے چائے کی ایک سپ لی۔

''صبا آپ سے ملاقات کی وجہ کوئی خاص بحث نہیں ہے دراصل مجھے آپ سے بہت لگاؤ اور انسیت ہو گئی ہے اور میں اس رشتے کو نام دینا چاہتا ہوں۔''

شاہ زیب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے صبا کی طرف دیکھا وہ بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور میری ملاقات کی وجہ آپ کو یہ بتانا تھا کہ ہماری شادی طے ہو گئی اور ہم اس فیصلے سے بہت خوش ہیں۔''

صبا نے شاہ زیب کی جانب ایک ڈبہ بڑھایا۔

''یہ مٹھائی میری شادی طے ہونے کی خوشی میں، میں آپ کے لیے لائی ہوں شادی میں ضرور آنا ڈاکٹر صاحب، خدا حافظ۔''

شاہ زیب نے صبا کے وہ آخری جملے سنے اور اس کا چہرہ شاہ زیب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وقت آواز کی رفتار کی طرح گذرنے لگا اور ایک دن شاہ زیب کو خبر ملی کہ صبا اپنے گھر کی ہو گئی۔ یہ سن کر شاہ زیب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اتھاہ گہرے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔

شاہ زیب نے یہ خبر اپنی امی کو بتائی تو والدہ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر صبا تمہارے نصیب میں لکھی ہوگی تو وہ تمہیں ضرور ملے گی اور اگر نہیں ہوگی تو سمجھنا وہ راستے میں ملنے والا ایک ایسا پرندہ تھا جو ہمیں جینا سکھا گیا۔''

شاہ زیب کی زندگی حسب معمول چل رہی تھی کچھ ہی دن بعد اس کی پوسٹنگ نیر کے ایک بڑے کالج میں کر دی گئی۔ شاہ زیب اپنی والدہ کو لے کر نیر آ گیا۔ اکثر راتوں کو شاہ زیب ان ہی خیالوں میں گم رہتا کہ آخر صبا سے اس کی ملاقات کیوں ہوئی وہ تو اس کے نصیب میں نہیں تھی۔

وقت پر لگا کر اڑ گیا اور شاہ زیب وقت کے ساتھ جینا سیکھ گیا چار سال بعد بھی یہی سوال اکثر شاہ زیب کی نیند میں خلل پیدا کرتا۔

ایک روز کالج سیمینار کے لیے شاہ زیب دوسرے کالج میں گیا وہ لمبے لمبے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا تبھی سامنے سے آنے والی ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

''اوہ! آئے ایم ساری''

وہ لڑکی کوئی اور نہیں صبا تھی۔ شاہ زیب صبا کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ شاہ زیب کو محسوس ہوا جیسے اتھاہ گہرے سمندر میں ڈوبتے ہوئے اس نے سہارا تلاش کر لیا ہو جو اسے واپس زمین تک لے آئے گا۔

''صبا آپ! کیا حال ہے؟''

''جی بہتر آپ سنائے اتنے دنوں تک کہاں چھپ گئے تھے۔''

صباء زمین پر بکھرے کاغذات سمیٹتے ہوئے بولی۔

''دراصل میری پوسٹنگ اس شہر میں ہوئی ہے مگر میں آپ کو یہاں دیکھ کر حیران ہوں۔''

''ہم یہاں جاب کرتے ہیں اور ابھی ہمارے لیکچر کا وقت ہو گیا ہے۔''

''جی ضرور جائیں، مگر کیا اس کے بعد ہماری ملاقات ممکن ہے۔''

صبا نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ کا ٹکڑا شاہ زیب کی طرف بڑھایا۔

''جی ضرور'' اور وہاں سے چلی گئی۔

شاہ زیب نے کاغذ کے ٹکڑے پر نظر ڈالی اس پر صبا کا فون نمبر لکھا ہوا تھا شاہ زیب نے گھر پہنچ کر اپنی امی کو صبا سے ملاقات کی ساری روداد سنائی۔ اس واقعہ نے شاہ زیب کو صبا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعہ چند دنوں بعد صبا اور شاہ زیب کی ایک کافی شاپ پر ملاقات ہوئی۔ شاہ زیب صبا کی زندگی کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت ان ہی خیالوں میں رہتا کہ آخر صبا کی زندگی میں چل کیا رہا ہے۔ وہ کیسی ہوگی، خوش ہے یا نہیں؟ اور بہت سی ایسی باتیں جن کا تعلق صبا کی زندگی سے ہو۔

شاہ زیب صبا کی طرف بڑھا۔

”کیا حال ہے صبا؟“

صبا نے شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آپ یہاں؟۔“

”جی ہاں! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

شاہ زیب نے صبا سے اس کی زندگی کے بارے میں معلومات لینی چاہی مگر وہ شاہ زیب کے سوالوں کے جواب دیے بنا ہی وہاں سے چلی گئی۔

شاہ زیب کو صبا کے اس رویے پر بہت حیرت ہوئی، اس نے اپنی والدہ سے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”امی کل میں صبا کے گھر جاؤں گا کوئی مصلحت ضرور ہوگی جو خدا نے صبا کو اتنے سالوں بعد دوبارہ میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔“

شاہ زیب دوپہر کے وقت صبا کے گھر پہنچا، صبا تھرڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی شاہ زیب نے بیل بجائی، دروازہ کھلا سامنے ایک خاتون کھڑی تھیں۔

”جی میں ڈاکٹر شاہ زیب ہوں، صبا سے ملنا تھا۔“

”میں صبا کی والدہ ہوں اندر آؤ۔“

صبا کی والدہ نے شاہ زیب کو بٹھایا اور خود پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”صبا نے آپ کے بارے میں مجھے بتایا تھا دراصل میں خود آپ سے ملنا چاہتی تھی اور آج صبا گھر پر نہیں ہے تو آپ سے بات ہو جائے گی۔“

”جی بولیے“

”میں آپ کو صبا کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں میری بیٹی کی زندگی میں اس دن سے مسئلے شروع ہو گئے جب وہ آپ سے مل کر آئی۔ ایک ہفتے کے بعد اس کا نکاح زید رضا میر کے ساتھ ہو گیا

”میں آپ کو صبا کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں میری بیٹی کی زندگی میں اس دن سے مسئلے شروع ہوگئے جب وہ آپ سے مل کر آئی۔ ایک ہفتے کے بعد اس کا نکاح زید رضا میر کے ساتھ ہوگیا زید صبا سے بہت محبت کرتا تھا اس کی ہر خواہش پوری کرتا رضا بھائی بھی صبا کو اپنی بیٹی مانتے تھے مگر زید کی والدہ صبا سے اچھا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔

شادی کو ایک سال گزرا تو زید اپنے کام کے سلسلے میں کچھ روز کے لیے شہر سے باہر چلا گیا تھا ان دنوں زید کی والدہ نے صبا کو بہت اذیت دی، زید کی واپسی کی خبر ملی صبا اس دن بہت خوش تھی مگر زید صبا کو ایسے چھوڑ کر گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا کار حادثے نے اس کی جان لے لی۔ زید کی موت کے بعد زید کی والدہ نے صبا کو گھر سے نکال دیا۔ وحید صبا کے والد یہ سب سہہ نہ سکے اور چند دنوں بعد وہ بھی ہمیں تنہا کر گئے“

زید صبا سے بہت محبت کرتا تھا اس کی ہر خواہش پوری کرتا رضا بھائی بھی صبا کو اپنی بیٹی مانتے تھے مگر زید کی والدہ صبا سے اچھا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔

شادی کو ایک سال گزرا تو زید اپنے کام کے سلسلے میں کچھ روز کے لیے شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ ان دنوں زید کی والدہ نے صبا کو بہت اذیت دی، زید کی واپسی کی خبر ملی صبا اس دن بہت خوش تھی مگر زید صبا کو ایسے چھوڑ کر گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا کار حادثے نے اس کی جان لے لی۔ زید کی موت کے بعد زید کی والدہ نے صبا کو گھر سے نکال دیا۔ وحید صبا کے والد یہ سب سہہ نہ سکے اور چند دنوں بعد وہ بھی ہمیں تنہا کر گئے۔“

صبا کی والدہ نے مزید کہا۔

”زید کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ زید کے پیار کی نشانی صبا کی

کوکھ میں پل رہی تھی۔ میں صبا کو لے کر یہاں آگئی ماریہ زید کی بیٹی یہیں پیدا ہوئی۔ اس واقعہ کو تین سال گزر گئے مگر میری بیٹی کے دل و دماغ پر وہ اب بھی تازہ ہے جب صبا نے آپ سے ملاقات کی اور چار سال پہلے آپ کی خواہش کا ذکر کیا۔ مجھے آپ واحد امید لگے جو میری بیٹی کو وہ ساری خوشیاں دے سکتے ہیں جن سے وہ کئی سالوں سے محروم ہے۔''

صبا کی والدہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اٹھی اور شاہ زیب کو پانی کا گلاس دیا اچانک ڈور بیل بجی اور صبا فلیٹ میں داخل ہوئی۔

''السلام علیکم امی جان! ماریہ کہاں ہے؟''

''سو رہی ہے بیٹا۔''

''آپ کب آئے ڈاکٹر صاحب''

''کافی دیر ہوگئی اب مجھے چلنا چاہیے، خدا حافظ پھر ملاقات ہوگی''

شاہ زیب گہری سوچ میں تھا۔ دل و دماغ پر صرف ایک ہی بات بار بار گھوم رہی تھی کہ آخر وہ اپنی امی کو کیسے منائے۔ انھیں خیالوں میں شاہ زیب کھویا ہوا تھا۔ امی نے کہا

''شاہ زیب جب سے آئے ہو بہت چپ چپ ہو۔''

''نہیں امی کوئی بات نہیں ہے بس وہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔''

''ہاں تو کہو نا اس میں اتنا سوچنا کیا!''

''امی میں نے آپ کو صبا کے بارے میں بتایا تھا نا۔۔۔''

''صبا اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہے!۔۔۔کیوں؟''

''شادی کے ایک سال بعد صبا کے شوہر کی کار حادثے میں موت ہوگئی اور وہ ایک بیٹی کی ماں ہے۔''

''یہ بتانے میں اتنا ڈر رہے تھے۔''

شاہ زیب کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''۔۔۔تمھارے پیدا ہونے کے چند سال بعد تمھارے والد انتقال کر گئے اس میں نہ قصور تمھارا تھا نہ میرا یہ اللہ کی مصلحت تھی مگر دنیا والوں نے سارا الزام تمھیں دیا کیا ملا انھیں اور کیا کھویا ہم نے؟۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔تم میرے بیٹے ہو اور میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ میرا بیٹا کوئی غلط فیصلہ نہیں کرے گا۔''

شاہ زیب نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

''امی۔۔۔۔''

شاہ زیب اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے صبا کو کیسے منانا ہے شام کا وقت تھا۔ آسمان میں سورج ہر طرف سونا بکھیرتا ہوا غروب ہو رہا تھا۔ چرندے پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے صبا ماریہ کو سلا کر کمرے سے باہر آئی اور اپنی والدہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''ماریہ سو گئی؟۔''

''جی امی جان۔''

''بیٹا زندگی تمھیں ایک اور موقع دے رہی ہے۔''

''وہ کیسے امی جان''

''شاہ زیب تمھیں بہت خوش رکھے گا۔''

''امی وہ مجھے کبھی نہیں اپنائیں گے۔''

''اگر وہ راضی ہو گیا تو۔۔۔؟''

''تو میں منع کر دوں گی امی میں نہیں چاہتی کہ میری بری قسمت کا اثر کسی پر ہو۔''

''بات کو سمجھو صبا۔۔۔''

صبا کچھ سوچے سمجھے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

دو روز بعد شاہ زیب نے صبا سے ملاقات کی۔

''صبا میں آپ کو اپنا ہمسفر بنانا چاہتا ہوں اگر آپ راضی ہوں تو۔۔۔؟

''آپ بہت اچھے انسان ہیں وہ بہت خوش قسمت ہوگی جو آپ کی ہم سفر بنے گی مگر آئے ایم ساری میں۔۔۔''

''صبا آپ کی زندگی ابھی بہت اچھی ہے مگر جب ماریہ بڑی ہوگی اس کی ضروریات میں اضافہ ہوگا۔۔۔اور تب اسے اپنے والد کی کمی محسوس ہوگی زندگی میں امید بھی ایک وقت تک ساتھ دیتی ہے جب امید ساتھ چھوڑتی ہے اس وقت آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت پڑتی ہے جو آپ کو ہمت اور امید دونوں دے۔۔۔۔صبا آپ اپنے نہیں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچیے۔۔۔ماں بن کر سوچیے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ماریہ کو کبھی اپنے والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔''

صبا نے لمبی سانس لی۔

''جب امید ساتھ چھوڑے گی کیا آپ میرا ہاتھ تھامیں گے؟''

شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے ہاں میں اپنا سر ہلایا۔

''آج میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے آج میں بہت خوش ہوں۔

□□□

Zubaida Moinuddin
65,Mahada colony,
Malegaon-423203 (MS)

صفیہ شمیم

غزل

امیدیں مٹ گئیں اب ہم نفس کیا
نشیمن کی خوشی رنج قفس کیا

بسر کانٹوں میں ہو جب زندگانی
بہار خندۂ گل یک نفس کیا

مری دیوانگی کیوں بڑھ رہی ہے
بہار آئی چمن میں ہم نفس کیا

نہ ہو جب رنگ آزادی چمن میں
تو پھر اندیشۂ قید قفس کیا

بہار نو کی پھر ہے آمد آمد
چمن اجڑا کوئی پھر ہم نفس کیا

زاہدہ زیدی

غزل

کہاں تک کاوش اثبات پیہم
کہاں تک زخم دل تدبیر مرہم

سکوت شب ہجوم ناامیدی
شمار داغ ہائے زیست اور ہم

کبھی عالم غبار چشم حیراں
کبھی وہ اک نگہ اور ایک عالم

بڑھاؤ جرأت افکار کی لو
ابھی ہے گرمی بزم جنوں کم

دہکنے دو ابھی داغوں سے محفل
چھلکنے دو ابھی پیمانۂ غم

یہ کس منزل پہ لے آئی تمنا
کہ بس اک درد تنہائی ہے محرم

ثمینہ راجہ

غزل

آسیب صفت یہ مری تنہائی عجب ہے
ہر سمت تری یاد کی شہنائی عجب ہے

اک بچھڑے شناسا سے ملاقات کے باوصف
بکھرے ہوئے لمحوں کی شکیبائی عجب ہے

اب سلسلۂ رنج و محن ٹوٹ بھی جائے
اس بار تو کچھ طرز پذیرائی عجب ہے

اب مجھ پہ کھلا اپنے در و بام کا افسوں
یوں ہے کہ مرے گھر کی یہ تنہائی عجب ہے

سورج سے اترتے ہیں مرے ہر بن مو پر
آنکھیں بھی رکھوں بند تو بینائی عجب ہے

ہر دن ستم ایجاد ہے ہر رات سیہ فام
یا رب یہ تری انجمن آرائی عجب ہے

پگھلا ہوا سونا تھی جو دیوار و سقف پر
وہ دھوپ گھڑی بھر میں ہی کجلائی عجب ہے

نس نس میں پھسلتا ہے ترے قرب کا نشہ
ہر موجۂ خوں ناب کی گہرائی عجب ہے

نوید اختر پروانہ برہانپوری

حجاب

حجاب حکمِ شرح حکمِ مصطفیٰ ہے حجاب
اجر ہے اس پہ بھی طاعتِ خدا ہے حجاب

حجاب ایسا ہو جیسا صحابیات کا تھا
کہ بے حیائی کا معکوس ہے حیا ہے حجاب

حجاب شان ہے بے شک خدا کی بندی کی
ہاں مومنات پہ احسانِ کبریا ہے حجاب

شعارِ دین ہے عزت نشانِ عفت ہے
کنیزِ فاطمہ محبوبِ فاطمہ ہے حجاب

رسولِ پاک نے دی ہے تجھے پہچان الگ
تو ہے عورت ترا زیور تری حیا ہے حجاب

جو اس سے دور ہے محروم ہے وہ عزت سے
خدا کا شکر کرو کہ تمھیں ملا ہے حجاب

بتاؤ کون سا زیور ہے سب سے بہتر تم
علی نے پوچھا تو زہرا نے یہ کہا ہے حجاب

ہے بے حیا تری بیوی تو کیسا شوہر ہے
اے مردِ سن تری غیرت کا جائزہ ہے حجاب

حیا حجاب ہے دوزخ کی آگ سے اے نوید
نجات نار سے جنت کا راستہ ہے حجاب

Navaid Akhtar Parwana Burhanpuri
Ghazi Salar Maidan,
Mulla, Mominpura
Burhanpur-450331 (MP)

لذیذ پکوان

بینگن کا اچار

اجزا: بینگن ایک کلو، لہسن ایک کھانے کا چمچ (پسا ہوا)، ادرک ایک کھانے کا چمچ (پسی ہوئی) ہری مرچ دس عدد (نمک، سرکہ، ادرک لہسن کا پیسٹ بنا کر مرچوں میں چیرا لگا کر بھر دیں)، چینی دو کھانے کے چمچ، لال مرچ ڈیڑھ کھانے کا چمچ (پسی ہوئی)، نمک حسب ذائقہ، ہلدی ڈیڑھ چائے کا چمچ، سرکہ ایک چھوٹی بوتل، کوکنگ آئل دو پیالی۔

بگھار کے لیے: سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، میتھی دانہ آدھا چائے کا چمچ، کڑی پتہ آٹھ عدد پتے، لہسن کے جوے ایک کھانے کا چمچ (باریک کٹے ہوئے)، ادرک ایک کھانے کا چمچ (باریک کٹی ہوئی)

ترکیب: سب سے پہلے بینگن ٹھنڈے پانی میں بھگو کر ہرے ڈنٹھل سمیت چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک کڑھائی میں کوکنگ آئل گرم کریں۔ جب گرم ہو جائے تو بگھار کے مصالحے ڈال کر سیاہ کر لیں۔ پھر ہلدی، مرچ، ذرا سے سرکے اور پانی میں ملا کر کڑھائی میں ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ پھر مصالحے بھری ہری مرچیں، بینگن کے ٹکڑے، چینی، نمک، باقی بچا ہوا سرکہ ڈال کر مزید پانچ منٹ تک بھونیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ اچار تیار ہے۔ بینگن ثابت رہنے دیں۔ اس اچار کو آپ پندرہ دن کے لیے رکھ سکتے ہیں اور اگر زیادہ دن رکھنا ہو تو سب چیزوں کے ساتھ تین کھانے کے چمچ املی کا رس ملا دیں۔

پی نٹ ٹومیٹو رائس

اجزا: سیلا چاول300 گرام، پیاز 1 عدد، کٹا لہسن5-6 جوے، ٹماٹر (4 ٹکڑے)3-4 جوے، ٹماٹر کا پیسٹ 4 کھانے کے چمچے، پسا زیرہ 1/2 چائے کا چمچہ، پسا گرم مصالحہ 1/2 چائے کا چمچہ، کٹی کالی مرچ1/2 چائے کا چمچہ، بھنی مونگ پھلی1/2 کپ، تیل2-3 کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب: پہلے 300 گرام سیلا چاولوں کو دھو کر 2 گھنٹوں کے لیے بھگو کر رکھ دیں۔ پھر انھیں ایک کنی نکال کر نکالیں اور چھان کر ایک طرف رکھ دیں۔ پھر ایک پین میں2-3 کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے5-6 جوے کٹا لہسن اور 1 عدد پیاز کو فرائی کر لیں۔ اب اس میں 4 کھانے کے چمچے ٹماٹر کا پیسٹ، 1/2 چائے کا چمچہ پسا زیرہ، 1/2 چائے کا چمچہ پسا گرم مصالحہ، 1/2 چائے کا چمچہ کٹی کالی مرچ اور حسب ذائقہ نمک

شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر اس میں 3-4 عدد کٹے ٹماٹر شامل کر کے بھون لیں۔ جب ٹماٹر گلنے کے قریب ہو جائیں تو 1/2 کپ بھنی مونگ پھلی اور اُبلے چاول شامل کر کے مکس کریں اور دم پر لگا دیں۔ دم پورا ہو جائے تو ڈش میں نکال لیں۔ پی نٹ ٹو میٹو رائس تیار ہیں۔

لذیذ تندوری آلو بنانے کا طریقہ

اجزا: آلو اُبلے ہوئے آدھا کلو، پسا ہوا لہسن اور ادرک ایک کھانے کا چمچ، ہری مرچ چوپ کی ہوئی تین عدد، ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) 1/4 گڈی، دہی (پانی نکلا ہوا) 250 گرام، پسا ہوا سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، پسی ہوئی دار چینی 1/4 چائے کا چمچ، پسا ہوا گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ، پسی ہوئی ہلدی ایک کھانے کا چمچ، پسی ہوئی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، تیل 4 کھانے کے چمچے، ٹماٹر، بڑی والی ہری مرچیں ہمراہ رکھنے کے لیے۔

ترکیب: دہی میں علاوہ آلو باقی تمام اجزا ملا لیں۔ آلوؤں کو چھیل کر 4،4 ٹکڑے میں کاٹ لیں۔ اسے دہی میں ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ ٹماٹروں کے بھی 4،4 ٹکڑے کاٹ لیں اور مرچیں موٹی موٹی کاٹ لیں۔ المونیم فوائل کے درمیانے سائز کے چوکور ٹکڑے کاٹیں، ہر ٹکڑے پر ایک آلو کا ٹکڑا، ہری مرچیں اور آلو کا تھوڑا سا مصالحہ ڈال کر لپیٹ لیں۔ اسے گرلر پر یا کوئلے پر اچھی طرح سے سینک کر اتار لیں اور گرما گرم پیش کریں۔

چاندپوری میٹھے چاول

اجزا: چاول آدھا کلو (ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں)، چینی ڈیڑھ پاؤ (شیرہ بنا لیں)، لونگ ایک چائے کا چمچ، پان کا پتہ ایک عدد، چھوٹی الائچی 6 عدد، پستہ، کشمش دو، دو کھانے کے چمچ (چوپڈ)، بادام کی گریاں دو کھانے کے چمچ (چوپڈ)، کیوڑہ 50 ملی لیٹر، گھی ایک پاؤ۔

ترکیب: آدھا گھی کڑکڑا کر لونگ اور پان کا پتہ ڈال کے انھیں

سرخ کر لیں۔ اس میں چاول ڈال کر بھونیں پھر شیرہ شامل کر کے آنچ تیز کر دیں۔ شیرہ تین حصے خشک ہو جائے تو الائچی کشمش، بادام، پستہ اور کیوڑہ ڈال دیں۔ دیگچی کا منہ آٹے سے بند کر دیں اور اسے کوئلوں پر ایک گھنٹہ تک رہنے دیں۔ اسے کھول کر اندازہ کر لیں کہ چاول گلیں ہیں یا نہیں۔ گل گئے ہوں تو باقی گھی گرم کر کے ڈالیں اور چند منٹ دم پر رکھیں۔ پھر چولہے سے اتار کر سرو کریں۔

شاہی ٹکڑے

اجزا: ڈبل روٹی 8 - 6 سلائسز، دودھ 2 / 1 - 1 لیٹر، چینی 6 کھانے کے چمچے، کنڈینسڈ ملک 2 کھانے کے چمچے، ہری الائچی 3-4 عدد، کھویا 4 کھانے کے چمچے، انڈا 1 عدد، زردے کا رنگ 1 چٹکی، تیل فرائی کے لیے۔

ترکیب: پہلے ڈبل روٹی کو سلائسز میں کاٹ لیں۔ پین میں تیل گرم کر کے سلائسز کو ہلکا فرائی کر لیں، یہاں تک کے گولڈن براؤن ہو جائیں۔ اب دودھ کو گرم کر کے اس میں چینی، الائچی، انڈے اور زردے کا رنگ ڈال کر مکس کریں۔ جب دودھ آدھا رہ جائے تو اس میں کنڈینسڈ ملک اور کھویا شامل کر لیں۔ اب ڈش میں سلائسز کو سیٹ کر کے بنایا ہوا مکسچر ڈال دیں۔ آخر میں پستے اور بادام سے گارنش کر کے سرو کریں۔

(بحوالہ: ڈالڈا کا دسترخوان)

حسین فاروقی

خون کا دباؤ

(بلڈ پریشر)

خون ہے خون یہ ٹپکے گا تو جم جائے گا۔ جسم میں سیال کی مانند ہوتا ہے اور دل کی کارگزاریوں کے سبب شریانوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ خون اپنی فطرت سے مجبور دوران کے سبب جب پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے تو قلب کے سکڑنے کے باعث قوت سے شریان میں داخل ہوتا ہے۔ شریانیں خون کی کثرت کی تاب نہ لاکر پھیل جاتی ہیں۔ یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے۔ شریانوں میں خون کی موجودگی اور اس کی دیوار کے ردعمل کی وجہ سے دباؤ پیدا ہوتا ہے۔

دل جیسا کہ آپ کو علم ہے خون کے دباؤ کو بنائے رکھنے میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے اسی لیے دل پر گزرنے والی کیفیات کا اثر بلڈ پریشر مرتب ہونا لازم ہوتا ہے اور دل جب سکڑی ہوئی حالت انقباضی کیفیت میں ہوتا ہے تو خون کا دباؤ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ خون کا دباؤ انقباضی خون کا دباؤ Systolic Blood Pressure کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس دل جب ایک ثانیہ کے لیے انبساط کے عالم میں ہوتا ہے تو خون کا

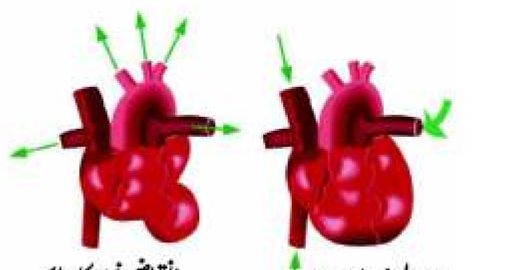

دباؤ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ خون کے اس دباؤ کو انبساطی خون کا دباؤ Diastolic Blood Pressure کہتے ہیں۔ انقباضی اور انبساطی خون کے دباؤ کا درمیانی فرق نبض کا باعث ہوتا ہے۔ یہ فرق اگر معمولی ہوتا ہے تو نبض کمزور ہوتی ہے اور فرق کی زیادتی میں نبض واضح ہوتی ہے۔

بلڈ پریشر کا علم حرارت اور عمل تنفس کے مثل مرض کی تشخیص میں معاون ہوتا ہے اور اس کی جانکاری سے نہ کہ قلب کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شریانوں کی صحت کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

بلڈ پریشر دریافت کرنے کے طریقوں کو بنیادی طور پر دو روپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) براہ راست (Direct) بلڈ پریشر دریافت کرنے کا طریقہ۔

(2) ذیلی (Indirect) طریقہ سے بلڈ پریشر دریافت کرنا۔

براہ راست بلڈ پریشر دریافت کرنے کا طریقہ کار: یہ طریقہ کار تجربہ گاہوں میں جانوروں پر تجربہ کرتے وقت اپناتے ہیں۔ پلاسٹک کی پتلی ٹیوب یا کھلی دھات کی نلی کو جو کہ سوئی کے مثل ہوتی ہے شریان میں داخل کرکے دھاگے سے باندھ دیتے ہیں بعد ازاں ان ٹیوب کے دوسرے سرے کو جو کہ شریان کے باہر ہوتا ہے سیال سکونیات کالم Hydrostatic column سے منسلک کردیتے ہیں۔ سیال سکونیات کالم کا پارہ خون کے دباؤ کی وجہ سے شیشہ کی نلی میں خود بخود بلند ہوتا ہے۔ پارہ کی سطح کو اسکیل پر پڑھ لیتے ہیں۔ یہی جانور کا اوسط خون کا دباؤ ہوتا ہے۔

بلڈ پریشر دریافت کرنے کا ذیلی طریقہ کار: ذیلی طریقے سے انسانوں کا بلڈ پریشر دریافت کرنے کے لیے ایک آلہ جسے اسفگمو مینومیٹر (sphygmomanometer) کہتے ہیں کام میں لاتے ہیں اس آلہ میں تقریباً بارہ سینٹی میٹر چوڑا ربڑ کا ایک بیگ ہوتا ہے جس پر پشمینہ غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ یہ ریشمی غلاف ربڑ کے بیگ تک محدود نہ رہ کر مثل پٹی کے آگے کی جانب نکلا ہوا

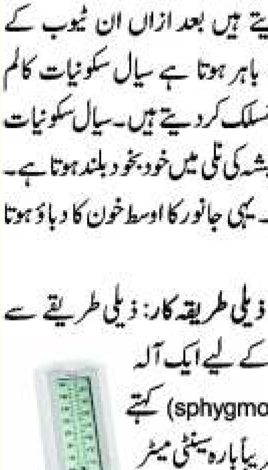

ہوتا ہے۔ ربر کے بیگ میں ہوا کے داخلہ کی غرض سے ربر کی ایک ٹیوب ہوتی ہے جس کے سرے پر ربر کی کھوکھلی گیند ہوتی ہے۔ ربر کی گیند کو دبا دبا کر بہ آسانی ہوا بیگ کے اندر بھری جاسکتی ہے۔ ہوا جب بھی بیگ میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے تو ٹیوب میں موجود والو کو بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بیگ میں موجود ہوا کے دباؤ کو معلوم کرنے کے لیے ایک مینومیٹر بھی ہوتا ہے جو کہ ٹیوب کے ذریعہ بیگ سے منسلک ہوتا ہے۔

خون کا دباؤ جب بھی اسفگمو مینومیٹر کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں تو آلہ کے ربر کے بیگ کو کہنی کے اوپر بازو اچھی طرح لپیٹ رہتی ہیں اور ریشمین غلاف کے زائد حصہ کو ربر کے بیگ اور بازو کی جگہ کے مابین ٹھونس دیتے ہیں۔ اس ترکیب سے کف بازو پر چپک جاتا ہے۔ اب ٹیوب کے سرے پر موجود ربر کی مختصر سی گیند کو بار بار دبا کر ہوا کو بیگ کے اندر داخل کرتے ہیں۔ بیگ میں ہوا کا جانا کیا ہوتا ہے بازو کے عضلات اور اس کے تئیں شریانیں پچک جاتی ہیں اور خون کا گزر ہاتھ کی سمت ممکن نہیں ہوتا ہے، کلائی کی نبض معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ تو ہوا بلڈ پریشر کے آلہ کا بیان اور اسے استعمال کرنے کا طریقہ آیئے اب بلڈ پریشر دریافت کرنے کی تکنیک کو جاننے کی کوشش کریں۔

نبض کی مدد سے بلڈ پریشر کی دریافت: بلڈ پریشر جب بھی اس ترکیب سے دریافت کرنا ہوتا ہے تو بتائے ہوئے طریقے سے کف کو بازو پر باندھتے ہیں اور ربر کی گیند کو دبا کر اس قدر ہوا بیگ میں داخل کرتے ہیں کہ بیگ سے منسلک مینومیٹر کا پارہ دو سو ملی میٹر کے نشان کو چھونے لگتا ہے

اور ساتھ ہی ساتھ کلائی پر رکھی ہوئی انگلیوں کے تئیں نبض معدوم ہو جاتی ہے۔ اب ٹیوب میں موجود والو کو کھول کر ہوا کو بیگ سے آہستہ آہستہ نکالنا شروع کرتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھتے ہیں کہ خون کا دباؤ کف کے دباؤ سے تھوڑا زائد ہو جاتا ہے اور خون کی روانی ہاتھوں کی سمت برقرار ہو جاتی ہے۔ نبض جیسے ہی کلائی پر ظاہر ہوتی ہے مینومیٹر کے پارہ کو اسکیل پر پڑھ لیتے ہیں۔ یہی خون کا انقباضی دباؤ ہوتا ہے۔ خون کا انبساطی دباؤ اس طریقے سے نہیں معلوم کیا جاسکتا ہے۔

استماعی طریقے سے خون کے دباؤ کی دریافت: خون کے دباؤ کو معلوم کرنے کا یہ طریقہ کورٹ کاف (Nikolai Korotkov) کی دین ہے اور اس کی بنیاد وہ آوازیں ہوتی ہیں جو کف کے دباؤ میں کمی لانے پر خون کے بریکیل شریان میں رواں ہونے سے نمودار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ڈاکٹر حضرات اس طریقے سے خون کا دباؤ دریافت کرتے ہیں تو اپنے مخصوص آلہ اسٹیتھسکوپ کے گول حصہ کو شریان پر رکھ کر آلہ کی ٹیوب کو کان میں لگا کر آوازیں سنتے دکھائی دیتے ہیں۔

استماعی طریقے سے جب خون کا دباؤ دریافت کرتے ہیں تو دستور کے مطابق کف کو بازو پر باندھتے ہیں اور سرعت سے ربر کی گیند کو دبا کر اس قدر ہوا کف میں داخل کرتے ہیں کہ کلائی پر نبض معدوم ہو جاتی ہے۔ نبض کے کلائی پر معدوم ہونے کے بعد ہوا کا داخلہ کف میں بند نہیں کرتے ہیں بلکہ 15 ملی میٹر پارہ کے برابر مزید ہوا کف میں داخل کرتے ہیں۔ اس عمل کی تکمیل کے بعد اسٹیتھسکوپ کے گول حصہ کو کف کے نیچے شریان پر رکھتے ہیں آہستہ آہستہ کر کے ہوا کف سے نکالنا شروع کرتے ہیں۔ کف سے ہوا کے نکلنے کی رفتار کا اندازہ مینومیٹر کے گرتے ہوئے پارہ سے کرتے ہیں۔

ہوا کے نکلنے کے باعث پارہ اگر دو تین ملی میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے نیچے آتا دکھائی پڑتا ہے تو ہوا کے نکلنے کی رفتار درست سمجھی جاتی ہے۔ اب اسٹیتھسکوپ کے گول حصہ کو بریکیل شریان پر رکھتے ہیں اور خون کی شریان میں روانی کے باعث پیدا شدہ آواز کی مدد سے مندرجہ ذیل تفصیلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خون کا دباؤ معلوم کرلیتے ہیں۔

اثنائے تغیر اول: کف سے آہستہ آہستہ کر کے ہوا نکالنے پر ایک اسٹیج ایسی بھی آتی ہے جس میں اسٹیتھسکوپ کے ذریعہ تھپکنے کے مثل آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز جو کہ ہوا کو پارہ کے دس ملی میٹر کے برابر مزید نکالنے پر تیز ہوتی ہے۔ انقباضی خون کے دباؤ کی نشاندہی کرتی ہے۔

اثنائے تغیر دوم: کف سے مزید ہوا نکالنے پر پارہ سے پندرہ ملی میٹر اور نیچے آنے پر آواز نسبتاً مدھم ہو جاتی ہے۔

بلڈ پریشر کی دریافت کے سلسلے سے ملحوظ نظر رکھنے والی احتیاطی تدابیر

1۔ مریض کے خون کا دباؤ معلوم کرتے وقت کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ بیمار ذہنی اور جسمانی طور پر پرسکون رہے۔

2۔ مریض کے شفاخانے میں داخل ہونے کے فوراً بعد بلڈ پریشر

نہیں دریافت کرتے ہیں بلکہ بیمار کو اس قدر وقت دیتے ہیں کہ وہ ماحول سے مطابقت پیدا کر لے اور اپنے کو اجنبی نہ محسوس کرے۔

3۔ بلڈ پریشر دریافت کرتے وقت مریض سے دلچسپ باتیں کرتے ہیں اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

4۔ بلڈ پریشر ناپنے والے آلہ مریض کی جسم کی سطح کے برابر رکھتے ہیں تاکہ دل اور آلہ کا لیول ایک رہے۔ ایسا نہ کرنے سے بلڈ پریشر کی ریڈنگ میں غلطی کے امکانات ہوتے ہیں۔

5۔ بلڈ پریشر دریافت کرتے وقت پھرتی سے کام لیتے ہیں۔ کف میں ہوا کا دباؤ دیر تک بنائے رکھنے سے بلڈ پریشر میں اضافہ کے امکانات ہوتے ہیں۔

6۔ بلڈ پریشر ناپنے سے قبل آلہ میں لگے کف اور مریض کی جسامت کا اندازہ کرتے ہیں۔ مریض اگر زیادہ موٹا ہوتا ہے تو لمبی پٹی والے آلہ کا استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کے خون کے دباؤ معلوم کرنے کے لیے بڑوں کے استعمال میں آنے والے آلہ کو کام میں نہیں لاتے ہیں۔

7۔ آلہ کے کف کی چوڑائی اگر بارہ اعشاریہ پانچ سینٹی میٹر سے کم ہوتی ہے تو اسے کام میں نہیں لاتے ہیں۔

8۔ بلڈ پریشر دریافت کرتے وقت صرف ایک ریڈنگ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دو تین مرتبہ خون کا دباؤ معلوم کرتے ہیں۔

بلڈ پریشر کا تعین: نظام قلبی اور عروقی Cardio vascular System میں خاص طور پر دل کے داہنے اور بائیں اذن اور بطن اور پھیپھڑوں کی شریانوں میں ایسے مقامات کی کمی نہیں ہوتی ہے جہاں پر اعصاب کے باریک باریک سرے صرف اس بات کے لیے موجود ہوتے ہیں جو کہ خون کی روانی کو محسوس کرتے ہیں بلکہ دل میں خون کی آمد دل سے خون کے اخراج سے متعلق ضروری اطلاعات دماغ کو فراہم کرتے ہیں۔ دماغ ان اطلاعات کے مدنظر جسمانی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے خون کا دباؤ معلوم پر بتائے رکھنے کے لیے اعصاب کے ذریعہ جسم کے دوسرے اعضا کو احکامات بھیجتا ہے۔ دل میں فی منٹ خون کی آمد میں ضرورت کے مطابق تغیر ہوتا ہے خون کا اخراج قلب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ شریانوں کے تناؤ میں فرق آتا ہے۔ شریانوں کی دیوار پر تناؤ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تناؤ...... جو کہ اعصاب کے زیر اثر ہوتا ہے شریانوں کو اپنی اصلی ہیئت پر بنائے رکھنے میں معاون ہوتا ہے اور خون کی روانی برقرار رہتی ہے۔ ذہنی پریشانی، جذباتی ہیجان اور محنت مشقت کی زیادتی میں جب انسانی ذہن پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے تو اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔ اعصاب کا متاثر ہونا شریانوں کے تناؤ میں فرق کا باعث ہوتا ہے جس کی وجہ سے وقتی طور پر خون کے دباؤ میں فرق پڑتا ہے۔

عمر اور جنس کا بھی اثر بلڈ پریشر پر ہوتا ہے۔ نوزائیدہ بچوں میں خون کا دباؤ 75/40 ہوتا ہے۔ جب کہ بڑھاپے میں 80 سال سے زائد کی عمر کے لوگوں میں خون کا دباؤ 160/90 کی حدود میں ہوتا ہے۔ صحت مند نوجوان آدمی کا خون کا دباؤ 125/75 سے لے کر 140/90 کے درمیان ہوتا ہے۔ عورتوں کا خون کا دباؤ مردوں کے مقابلہ میں نسبتاً کم ہوتا ہے۔ جسامت کا اثر بھی خون کے دباؤ پر ہوتا ہے۔ موٹے لوگوں میں انقباضی خون کا دباؤ اکثر بڑھا ہوتا ہے۔ انسان کی کارکردگی میں اضافہ محنت مشقت کی صورت میں وقتی طور پر خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور زیادہ دیر تک کھڑے رہنے سے آدمی کے انبساطی خون کے دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ رات میں آدمی جب محو خواب ہوتا ہے تو انقباضی خون کے دباؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کھانا کھانے کے بعد انقباضی بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ □□□

(تیمارداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن:1990)

حمیرا خاتون

جلد کی دیکھ بھال

معلومات، مسائل اور حل

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اپنے چہرے کے متعلق ہر انسان حساس ہوتا ہے لیکن چہرے کی تروتازگی بنائے رکھنے کے لیے جن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے ہمیں اس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ چہرہ ہمارے جسم کا اہم حصہ ہوتا ہے اس لیے ہمیں اس کی تازگی بنائے رکھنے کے لیے ہمیشہ چاق و چوبند رہنا چاہیے۔ آیئے جانتے ہیں کہ چہرے کی نگہداشت کس طرح کی جانی چاہیے تاکہ چہرے کی قدرتی کشش برقرار رکھی جاسکے۔

چہرے کی جلد چار طرح کی ہوتی ہے۔

(1) نارمل

(2) خشک

(3) چکنی

(4) ملی جلی

جلد باہر اور اندر کے خلیات کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ آکسیجن اندر لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ باہر چھوڑتی ہے۔ پسینے کے ساتھ جلد کے اندرونی حصہ کا میل باہر نکل جاتا ہے جلد باہری گندگی کو اندر جانے سے روکتی ہے۔

جلد کے اثرات:

باہری اثرات

دھوپ، دھول، مٹی، میک اپ، آلودگی، کاسمیٹک، غیر متوازن غذا سے ہونے والے برے اثرات باہری اثرات کہلاتے ہیں ان کی روک تھام کی جاسکتی ہے اور کافی حد تک ٹھیک بھی کیا جاسکتا ہے۔

اندرونی اثرات: جسم میں قدرتی نظام کے سبب پیدا ہونے والے اثرات جیسے بیماری، بڑھتی عمر، عادت واطوار وغیرہ جن کو بدلا نہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی روکا جا سکتا ہے۔

جلد کی پرتیں 2 طرح کی ہوتی ہیں:

Epidermis(اوپری پرت)

یہ جلد کی اوپری پرت ہوتی ہے۔ جس کے کٹ جانے یا پھٹ جانے سے درد نہیں ہوتا نہ ہی خون نکلتا ہے اور 24 گھنٹے کے بعد یہ واپس جڑ جاتی ہے۔

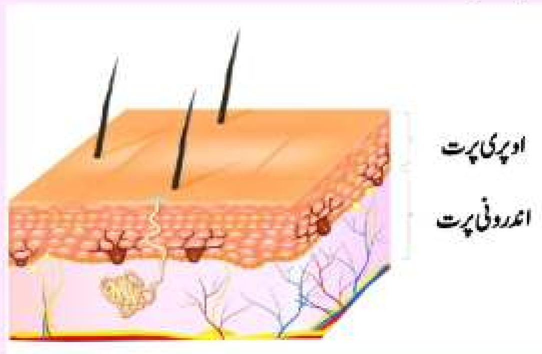

Dermis(اندرونی پرت)

یہ اندرونی پرت ہوتی ہے جس کے کٹ جانے، پھٹ جانے سے درد ہوتا ہے اور خون بھی نکلتا ہے۔ اس پرت کو آپس میں جڑنے میں وقت لگتا ہے۔ جلد پر چھوٹے چھوٹے مسام ہوتے ہیں۔ جن کی جڑوں میں غدود ہوتے ہیں جو ایک قسم کی چکنائی باہر نکالتے ہیں۔ کسی جلد سے زیادہ چکنائی اور کسی سے کم چکنائی نکلتی ہے جس کی بنا پر ہم یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ جلد چکنی ہے یا خشک۔

جلد کی دیکھ بھال:

جلد کی دیکھ بھال کو 5 حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

صفائی۔ چہرے کے مسام کو کلنزنگ ملک یا کچے دودھ کے ذریعے گہرائی میں صاف کرنا۔

ٹونگ۔ مسام کو بند کرنے کے لیے ٹونر یا گلاب جل کا استعمال کرنا۔ جس سے مسام میں کساؤ آسکے۔

چہرے کی نمی۔ چہرے کی نمی قائم رکھنے کے لیے موئچرائزر ضروری ہوتا ہے۔ موئچرائزر سے جلد نرم رہتی ہے۔

چہرے کا مساج۔ جلد اور عمر کے مطابق چہرے کا ہلکے ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں اور چہرے کو آرام دیں۔

فیس ماسک۔ باہری اثرات سے بچنے کے لیے اچھے گھریلو فیس ماسک کا استعمال کریں۔

گلاب جل بنانے کا طریقہ

100 گرام گلاب جل کی پتیاں صاف کرکے دھولیں اور ایک ایر ٹائٹ جار میں ڈالیں پھر اس میں ایک کلو ابلا ہوا پانی ڈال کر تقریباً 3 گھنٹے تک جار کو بند کرکے رکھیں۔ 3 گھنٹے بعد جار کو کھول کر اس پانی کو چھان

لیں۔ گلاب کی پتیوں کو آپس میں رگڑے نہیں۔ اس گلاب جل بوتل میں بھر کر تقریباً 25-20 دن تک رکھ سکتے ہیں۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ اس گلاب جل کا استعمال صرف چہرے کے لیے کریں اس کو آنکھوں میں بالکل نہ ڈالیں۔

Humera Khatoon
1033, Haveli Bakhtawar Khan
Matia Mahal , Jama Masjid, Delhi-110006

تاثرات: نگرنگرسے

خواتین دنیا نومبر 2018 کا شمارہ زیر مطالعہ رہا۔ یہ نسائی مزاج رسالہ خواتین کے دیگر رسائل کے درمیان اپنی علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ اس کے مشمولات میں ادب کے علاوہ طبی معلومات، لذیذ پکوان اور آرائش و زیبائش سے متعلق کارآمد تجاویز گویا خواتین کے ذوق کا سارا سامان موجود ہے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی نے مالوہ کی متوطن ایک قدیم اور اہم شاعرہ مہر النساء مہر زریں سے متعارف کرایا ہے۔ جہاں تک جہانِ نسواں کے تحت شائع شدہ مضامین کا سوال ہے ان میں بعض مضامین پر ملازمتی تقاضے یا سیمینار کے لیے عجلت میں لکھے گئے مقالوں کا گمان ہوتا ہے۔ عمرانہ خاتون نے ایک منفرد موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے انتہائی عرق ریزی سے ہندوستان کی مختلف جامعات میں اردو زبان و ادب کی تعلیم دینے والی خواتین کی ادبی کاوشوں کی فہرست سازی کی ہے۔ ان معتبر خواتین کی خدمات کا اعتراف ایک قابل تحسین کوشش ہے۔ اس شمارے کے دیگر مضامین میں پروفیسر توقیر عالم کا مضمون 'جدید شاعری میں تانیثیت' اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف کا قلم چار چھ شاعرات پر ہی مرکوز رہا ہے جبکہ اکیسویں صدی کی شاعرات کے یہاں تانیثیت اپنی پیش رو شاعرات سے بالکل مختلف انداز لیے ہوئے ہے۔ امید ہے وہ اپنے اگلے مضمون میں اس کا ازالہ کریں گے۔

حسن سخن میں غزلوں کا انتخاب عمدہ ہے۔ البتہ افسانوں کا حصہ کچھ کمزور سا لگا۔ بازیافت کے طور پر عصمت کا افسانہ 'یار' پسند آیا۔

حلیمہ فردوس، بنگلور

ماہنامہ 'خواتین دنیا' اکتوبر 2018 کے شمارہ کی پی۔ ڈی۔ ایف فائل کے ورق ورق کو پڑھنے کا ذریعہ، ٹچ اسکرین پر پھیلتی ہوئی انگلیاں بن گئیں۔ اکیسویں صدی کا ڈیجیٹل قاری اب کتب و رسائل کا مطالعہ کچھ اس انداز سے کرتا ہے۔ مگر آج کی ڈیجیٹل زندگی میں بھی انگلیوں کے پوروں کو نم کر کے رسالہ پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

رسالہ کسی بھی زبان کا ہو اپنے ملک کی مشترکہ تہذیب کا اہم جزو ہے جس میں موجودہ عہد کی داستان رنگ زندگی کی راگنیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کے لیے اہم کام کر رہی ہے۔ خواتین دنیا کا تازہ شمارہ اپنے مشمولات کی وجہ سے متاثر کر گیا۔

خورشید حیات، بلاسپور، چھتیس گڑھ

'ماہنامہ خواتین کی دنیا' یقیناً قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ایک انقلابی قدم ہے۔ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کی بے پناہ مقبولیت اور کامیابی کے بعد اب 'ماہنامہ خواتین کی دنیا' کی پذیرائی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ دعا ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے اور اسے ملک و قوم کی ترقی کا وسیلہ بنائے۔

کلثوم فاطمہ نصیر، گیسٹ فیکلٹی (انگلش) جے این یو، نئی دہلی

'خواتین کی دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شاعری کے لیے مخصوص گوشہ 'حسن سخن' کا جواب نہیں۔ موضوع کی مناسبت سے تصویریں لگا کر اتنا دیدہ زیب اور پرکشش بنا دیا گیا ہے کہ قاری متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نور الصباح نے قرۃ العین حیدر اور غزالہ فاطمہ نے عصمت چغتائی کو سمجھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ رضیہ پروین کے مضمون میں تھوڑی سی عجلت ہے پھر بھی وہ قابل مبارکباد ہیں، زبان و بیان پر بہت اچھی گرفت ہے۔ افسانوی گوشہ بھی عمدہ ہے۔ سفینہ بیگم نے اس عیار اور مفاد پرست زمانے کے المیہ کو افسانوی قالب میں بڑی خوبصورتی سے ڈھال دیا ہے۔

شہناز رحمٰن، علی گڑھ

خواتین خبرنامہ

میری کوم: بلند حوصلوں نے دنیا کو قدموں پہ جھکا لیا

26 نومبر، اخبار مشرق، کولکاتا۔ کشتی، کبڈی اور باکسنگ ایسے کھیل ہیں جس پر صرف مردوں کی اجارہ داری تھی لیکن اب یہ کھیل خواتین میں بھی مقبول ہونے لگا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساکشی ملک اور پوگارٹ

نے خواتین کشتی مقابلے میں اولمپک تمغے جیت کر قومی پرچم بلند کیا تو باکسنگ میں منی پور کی خاتون ایم سی میری کوم نے پوری دنیا میں اپنا دبدبہ قائم کر کے خواتین باکسنگ کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ ابھی گزشتہ ہفتہ 24 نومبر 2018 کو ایم سی میری کوم نے یوکرین کی ہنا اوکھوتا کو خطابی معرکہ میں شکست دے کر چھٹی بار خواتین ورلڈ باکسنگ چمپئن شپ کا خطاب اپنے نام کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اس سے قبل اس منی پوری باکسر نے 2002, 2005, 2006, 2008 اور 2010 میں ورلڈ خواتین چمپئن شپ کا خطاب جیت کر آئرلینڈ کی کیٹی ٹیلر کے ساتھ مشترکہ طور پر سب سے زیادہ عالمی خطاب جیتنے کا شرف حاصل کیا تھا لیکن اب چھٹی بار اس نے عالمی چمپئن شپ میں گولڈ میڈل جیت کر ٹیلر کو پیچھے چھوڑ دیا اور نئی تاریخ اپنے نام کرلی۔

ایم سی میری کوم نے ہندوستان میں خواتین باکسنگ کو نئی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ منی پور کے دیہی ضلع چورا چند پور کے گاؤں موئرانگ لاکھائی میں پیدا ہونے والی میری کوم نے غربت کو نہایت ہی قریب سے دیکھا ہے اور بچپن سے ہی غربت سے جنگ لڑتی رہی ہے اس لیے آج 35 سال کی عمر میں بھی اس کے حوصلے اسی طرح جواں ہیں، 3 بچوں (دو بیٹیاں، ایک بیٹا) کی ماں ہونے کے باوجود باکسنگ رنگ میں یہ شیرنی کی طرح اترتی ہے اور حریف باکسر کو پچھاڑ کر فائٹ اپنے نام کر لیتی ہے۔ اسکول کے زمانے میں وہ مختلف کھیلوں میں حصہ لیتی تھی جس میں والی بال، فٹبال، ایتھلیٹکس، جاولین تھرو اور 400 میٹر کی دوڑ شامل تھی لیکن جب منی پور کے ڈینگو سنگھ نے بنکاک ایشین گیمس 1998 میں طلائی تمغہ جیت کر وطن واپسی کی تو اس کے والہانہ استقبال نے میری کوم کے ارادے میں تبدیلی پیدا کی اور وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر باکسنگ میں ملک کا نام روشن کرنے کا تہیہ کر لیا اور اپنا گاؤں چھوڑ کر منی پور کی راجدھانی امپھال آ کر اس نے باکسنگ کی باقاعدہ تربیت لینا شروع کر دیا، اس کے اولین باکسنگ گرو کوسانا میتائی کا کہنا ہے کہ اس لڑکی میں سیکھنے کا جذبہ دوسروں کے مقابلے بہت زیادہ تھا اس لیے اس نے ساری حکمت عملیاں بہت جلد سیکھ لیں جس کے لیے برسوں لگ جاتے ہیں۔ اس نے اپنی ٹریننگ کو مزید بہتر کرنے کے لیے ریاستی باکسنگ کوچ ایم نرجیت سنگھ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کر لیا اور پھر 6 تا 12 فروری 2001 کو جب خواتین کا پہلا نیشنل چمپئن شپ ہوا اس میں میری کوم نے طلائی تمغہ جیت کر قومی سطح پر اپنی شناخت قائم کر لی۔ اس کامیابی کے بعد سے اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، نیشنل چمپئن شپ میں ہر سال طلائی تمغہ جیتنے والی میری کوم نے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور 2001 میں ہی امریکہ کے پنسیلوانیا میں ہونے والی ویمنس ورلڈ امیچر باکسنگ چمپئن شپ کے فائنل تک

رسائی کرنے کے باوجود طلائی تمغہ سے محروم رہی لیکن اس نے سلور میڈل اپنے نام کر لیا، مگر اس منی پوری خاتون باکسر کی تیاریاں جاری رہیں اس نے ترکی کے انتالیا میں ہونے والے ویمنس ورلڈ امیچر باکسنگ چمپئن شپ 45 کلوگرام وزن کیٹگری میں طلائی تمغہ جیت کر یہ ثابت کیا کہ وہ بین الاقوامی سطح پر بھی بہترین باکسر ہے۔

اپنی جہد مسلسل کے سبب میری کوم نے خواتین باکسنگ کو جس بلندیوں تک پہنچایا اس کے لیے انھیں پوری دنیا سے مبارک باد کے پیغامات آتے رہتے ہیں اور ان کے کارنامے پر مختلف اداروں کے ساتھ ساتھ کئی ریاستی حکومتوں (راجستھان، منی پور، آسام، اروناچل پردیش) کے ساتھ ساتھ کئی ریاستی حکومت نے بھی نقد انعامات کے ساتھ ساتھ اعزازات بھی دیے۔ لندن اولمپکس 2012 میں کانسہ کا تمغہ جیتنے پر راجستھان حکومت کی جانب سے 50 لاکھ روپے اور دو ایکڑ زمین، آسام کی جانب سے 20 لاکھ روپے، اروناچل پردیش کی جانب سے 10 لاکھ روپے، نارتھ ایسٹرن کونسل کی جانب سے 40 لاکھ روپے مرکزی حکومت کے وزارت قبائل کی جانب سے 10 لاکھ روپے بطور انعام ملے تھے۔ اس کے علاوہ میری کوم کی ذاتی زندگی پر ہندی فلم بھی بنی جس میں بالی ووڈ کی نامور اداکارہ پرینکا چوپڑہ نے میری کوم کا مرکزی کردار بخوبی نبھا کر اس کی شہرت کو گھر گھر پہنچا دیا۔ انٹرنیشنل باکسنگ ایسوسی ایشن (AIBA) نے خواتین باکسنگ کے فروغ کے لیے میری کو اپنی سفیر مقرر کیا تو مرکزی حکومت نے 2003 میں میری کوم کو سب سے پہلے ارجن ایوارڈ سے نوازا تھا تو 2006 میں اسے پدم شری ایوارڈ اور 2009 میں کھیل کود کے سب سے بڑے قومی ایوارڈ راجیو گاندھی کھیل رتن ایوارڈ سے نواز کر میری کوم کی کاوشوں کو سراہا۔ 2013 میں اس خاتون باکسر کو پدم بھوشن ایوارڈ دیا گیا تو 2016 میں صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے اس باصلاحیت خاتون باکسر کو راجیہ سبھا کا کارکن نامزد کر کے اسے ملک کے پارلیمنٹ تک پہنچا دیا۔

روحا خورشید نے حاصل کیے 13 گولڈ میڈل

2 دسمبر، دیپک بھاسکر، رانچی نیشنل لاء یونیورسٹی آف اسٹڈی اینڈ ریسرچ ان لاء کے جلسہ تقسیم انعامات میں 13 گولڈ میڈل جیتنے والی روحا خورشید سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئی ہیں۔ روحا نے 2013-2018 تک کے کل 13 گولڈ میڈل حاصل کیے جس میں ایک بطور کلاس ٹاپر اور دوسرے میڈیکل کارپوریٹ لاء، کانسٹی ٹیوشنل لاء، لیبر لاء، ہیلتھ اور ماحولیاتی لاء وغیرہ کے لیے دیے گئے۔ روحا نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امتحان میں اچھے نمبروں کی امید تھی لیکن 13 گولڈ میڈل میں

حاصل کر پاؤں گی اس کی امید نہیں تھی۔ روحا نے اپنی محنت کو ہی کامیابی کی کنجی بتایا اور کہا کہ مستقبل میں اپنے حق سے محروم لوگوں کو ان کا حق دلانے کی پوری کوشش کروں گی۔ ابھی وہ بنگلور میں پریکٹس کے ساتھ ساتھ کارپوریٹ لاء کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔

روحا رسالدار نگر میں رہتی ہیں ان کے والد جمیل احمد میڈیکل آفیسر اور والدہ رضوانہ احمد گھریلو خاتون ہیں۔ روحا نے اپنی تعلیم رانچی کے ویشپ ویسٹ کوٹ اور ڈی۔ پی۔ ایس اسکول سے حاصل کی۔ انھوں نے 10 ویں جماعت میں جہاں 94.4% فیصد نمبر حاصل کیے وہیں بارہویں جماعت میں 95.2% فیصد کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ رانچی کی اس بیٹی کو اس کی شاندار کامیابی کے لیے ہر کوئی مبارک باد دے رہا ہے۔

سبیرا حارث کی نمایاں کارکردگی

28 نومبر، راشٹریہ سہارا، علی گڑھ (ایس این بی)۔ نیشنل شوٹنگ چمپئن شپ کے 62 ویں شاٹ گن ایونٹ میں علی گڑھ کی سبیرا حارث نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گیارہواں مقام حاصل کر کے نیشنل ٹیم کے ٹرائل میں شامل ہو کر ضلع علی گڑھ کا نام روشن کیا۔ سبیرا حارث نشانہ باز حارث الاسلام کی بیٹی ہیں، سبیرا حارث نے مذکورہ مقابلہ میں ویمن سب جونیئر زمرے میں 85 نمبر حاصل کر کے گیارہواں مقام درج کرایا ہے۔ سبیرا حارث نے اپنی اس کامیابی کو اللہ کی عطا اور اپنے والد حارث الاسلام کی تربیت کو قرار دیا ہے۔ مذکورہ مقابلہ 3 دسمبر تک جگت پورہ شوٹنگ رینج جے پور میں نیشنل رائفل شوٹنگ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا جس میں ملک بھر کے نشانہ بازوں نے حصہ لیا۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

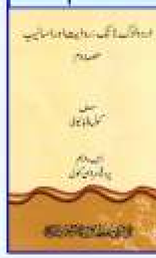

مصنف: کنول ڈبائیوی

ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول

صفحات: 482

قیمت: 162 روپے

سراج اورنگ آبادی (مونوگراف)

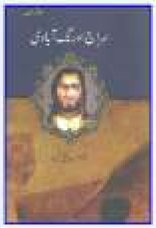

مصنف: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

صفحات: 129

قیمت: 78 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

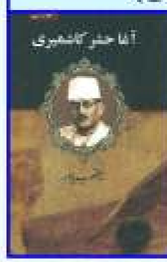

مصنف: یعقوب یاور

صفحات: 132

قیمت: 81 روپے

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)

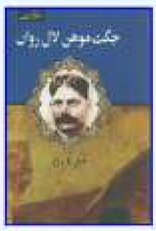

مصنف: صغیر افراہیم

صفحات: 146

قیمت: 86 روپے

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

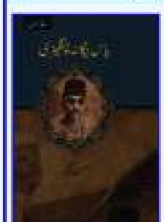

مصنف: حسن مثنی

صفحات: 149

قیمت: 90 روپے

قاضی عبدالودود (مونوگراف)

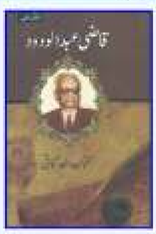

مصنف: آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 130

قیمت: 80 روپے

دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)

مصنف: عبدالسمیع

صفحات: 162

قیمت: 90 روپے

علی سردار جعفری (مونوگراف)

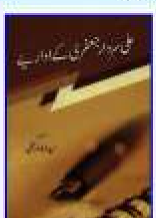

مصنف: عمر رضا

صفحات: 165

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2019, Vol. 03, Issue: 1 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025